لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

تعارفِ اسلام وقت کی اہم ترین ضرورت

غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے کی کوشش کریں اور ایسے کسی موقع کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں، ہمارے پاس سب سے بڑی طاقت وہ فطری، معقول، پرکشش اور دل و دماغ کو تسخیر کرنے والا دین، قرآن مجید کا اعجازی صحیفہ اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلکش اور دل آویز سیرت اور اسلام کی قابل فہم اور قابل عمل عقل سلیم کو متاثر کرنے والی تعلیمات ہیں، جو اگر کھلے دماغ اور صاف ذہن سے پڑھی جائیں تو اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں چنانچہ انہیں تعلیمات نے دنیا کے وسیع ترین رقبہ اور متمدن اور ذہین قوموں کو اپنا عاشق اور اپنے اوپر کاربند بنالیا اور ملک کے ملک (جو اپنی صدہا سال کی تہذیبیں، فلسفے اور حکومتیں رکھتے تھے) ان کے حلقہ بگوش اور ان کے داعی و مبلغ بن گئے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اس فرض کی ادائیگی میں اپنی اس ذمہ داری کے احساس و شعور میں بڑی کوتاہی کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں اکثریت کے لوگ اسلام کی ان روزمرہ کی خصوصیات، نشانیوں اور اذان و نماز کے بارے میں بعض اوقات ایسے سوالات کرتے ہیں کہ بجائے ان پر ہنسی آنے کے اپنی کوتاہی پر رونا آنا چاہیے، وہ ان کے مفہوم و مطلب سے اتنے ناواقف ہیں، جن کا قیاس میں آنا مشکل ہے، اس مقصد کے لیے اردو، انگریزی اور ہندی میں اسلام کے تعارف میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان سے کام لیا جاسکتا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

فی شمارہ ₹20

۲۵/اکتوبر ۲۰۱۸ء

سالانہ زرتعاون
₹400

شعروادب

کھلا ہے مجھ پر یہ رازِ ہستی کہ مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

اصغرؔ گونڈویؒ

مجاز کیسا ؟ کہاں حقیقت ؟ ابھی تجھے کچھ خبر نہیں ہے
یہ سب ہے اک خواب کی سی حالت جو دیکھتا ہے سحر نہیں ہے

شمیمِ گلشن ، نسیمِ صحرا ، شعاعِ خورشید ، موجِ دریا
ہر ایک گرمِ سفر ہے ان میں مرا کوئی ہم سفر نہیں ہے

نظر میں وہ گل سما گیا ہے تمام ہستی پہ چھا گیا ہے
چمن میں ہوں یا قفس میں ہوں مجھے اب اس کی خبر نہیں ہے

چمک دمک پر مٹا ہوا ہے یہ باغباں تجھ کو کیا ہوا ہے
فریبِ شبنم میں مبتلا ہے چمن کی اب تک خبر نہیں ہے

یہ مجھ سے سن لے تو رازِ پنہاں سلامتی خود ہے دشمنِ جاں
کہاں سے رہرو میں زندگی ہو کہ راہ جب پر خطر نہیں ہے

میں سر سے پا تک ہوں مے پرستی، تمام شورش، تمام مستی
کھلا ہے مجھ پر یہ راز ہستی کہ مجھ کو کچھ بھی خبر نہیں ہے

ہوا کو موجِ شراب کر دے فضا کو مست وخراب کر دے
یہ زندگی کو شباب کر دے، نظر تمہاری نظر نہیں ہے

پڑا ہے کیا اس کے در پہ اصغرؔ وہ شوخ مائل ہے امتحاں پر
ثبوت دے زندگی کا مرکز نیاز اب کارگر نہیں ہے

☆☆☆☆☆

اداریہ

انسانیت کے کام آنے کی ضرورت

شمس الحق ندوی

''میں شہادت دیتا ہوں کہ انسان انسان بھائی ہیں''، جس کے منہ سے یہ بول نکلے تھے، یہ اسی کی پیدائش کا دن ہے، اس نے آکر دنیا کو یہ پیغام دیا تھا، بتایا تھا کہ نسل کی، رنگ کی یا وطنی تقسیم کی بنا پر کسی سے جنگ کرنا یا کسی کو حقیر وذلیل سمجھنا حماقت ہے، یہ ساری چیزیں غیر اختیاری ہیں، انسان کے کردار کا، اس کے شرف وعظمت کا، ان سے کیا سروکار اور اسی نے آکر یہ منادی کی تھی کہ:" الخلق عيال الله فأحب الخلق الى الله من أحسن إلى عياله"(مخلوق اللہ کا کنبہ ہے تو مخلوق میں اللہ کی نظر میں محبوب ترین وہی ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ بہترین سلوک سے پیش آئے)۔

مہر ومحبت کے اس پیامبر کو، شفقت والفت، ہمدردی وانسانیت کے اس سچے پیام رساں کو رسول بنا کر بھیجنے والے مالک وخالق نے اس کو "وَمَا أَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ" [انبیاء:۱۰۷] کے الفاظ سے مخاطب فرمایا ہے، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ اس نے مصائب ومشکلات کے ناقابل قیاس مرحلوں سے گزر کر پورے عالم کے لیے بارانِ رحمت بن کر انسانیت کی سوکھی ہوئی کھیتی کو گل وگلزار بنا دیا۔

ذرا تصور کیجیے کہ طائف کے لڑکے اس کے پیچھے لگا دیئے گئے ہیں اور پتھروں کی بارش ہو رہی ہے، جب وہ لہولہان ہو کر نڈھال ہو جاتا ہے، تاب برداشت نہ رکھتے ہوئے زمین پر بیٹھ جاتا ہے تو یہی اوباش لڑکے اس کا بازو پکڑ کر کھڑا کر کے پھر پتھروں کی بارش شروع کر دیتے ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے الفاظ میں: گھٹنے چور ہو گئے، پنڈلیاں گھاؤ ہو گئیں، کپڑے لال ہو گئے، معصوم قدم خون سے لال ہو گئے، یہ وہ مرحلہ تھا جہاں وہ بے قرار ہو کر اس طرح فریاد کرتا ہے: اللّٰهم إليك أشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهواني على الناس الخ. میرے اللہ! تیرے پاس اپنی بے زوری کا شکوہ کرتا ہوں، تیرے سامنے اپنے وسائل وذرائع کی کمی کا گلہ کرتا ہوں، دیکھ! انسانوں میں میں ہلکا کیا گیا، لوگوں میں میری کیسی سبکی ہو رہی ہے، اے سارے مہربانوں میں سب سے مہربان مالک! میری سن میرا زور میرا رب تو ہی ہے، مجھے تو کن کے سپرد کرتا ہے، جو ہم سے دور ہوتے ہیں تو مجھے ان سے نزدیک کرتا ہے یا تو نے مجھ کو میرے سارے معاملات کو دشمنوں کے قابو میں دے دیا ہے؟ پھر بھی اگر مجھ پر تیرا غصہ نہیں ہے تو مجھے ان باتوں کی کیا پرواہ، مگر کچھ بھی ہو، میری سمائی تیری عافیت کی گود میں ہے، تیرے چہرے کی وہ جگمگاہٹ جس سے تاریکیاں روشنی بن جاتی ہیں، میں اسی نور کی پناہ میں آتا ہوں کہ اسی سے دنیا وآخرت کا سدھار ہے، مجھ پر تیرا غصہ بھڑکے اس سے پناہ مانگتا ہوں، مجھ پر تیرا غضب ٹوٹے اس سے تیرے سایہ میں آتا ہوں، منانا ہے، اس وقت تک منانا ہے جب تک تو راضی نہ ہو جائے، نہ قابو ہے نہ زور ہے، مگر علی وعظیم اللہ ہی ہے۔

اس بے کسی اور بے چارگی کی صدائے دل دوز سے ملأ اعلیٰ میں جنبش ہوتی ہے، جبرئیل امین پکار رہے ہیں، سن لیا، اللہ نے سن لیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ کہا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے پاس پہاڑوں کو نہیں بلکہ پہاڑوں کے فرشتوں کو بھیجا ہے، اس پہاڑ کے فرشتہ نے سلام کیا، پھر اجازت مانگی، کیا ان پر (طائف کے ان پتھر مارنے والوں پر) ان دونوں پہاڑوں کو (جس سے طائف گھرا ہوا ہے) الٹ دوں؟

اس دل دکھے اور کچلے ہوئے کا جواب سنئے: ''میں مایوس نہیں ہوں کہ ان کی پشت سے ایسی نسلیں نکلیں جو اللہ ہی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک اور ساجھی نہ بنائیں''۔

حفیظ جالندھری کے الفاظ میں ؎

الٰہی فضل کر کہسار طائف کے مکینوں پر
الٰہی پھول برسا پتھروں والی زمینوں پر

پھر دنیا نے دیکھا کہ جو اس طرح کچلا گیا تھا، پامال و نڈھال کیا گیا تھا، وہ کس طرح بڑھا کہ وہی ستانے والے پھر سننے لگے اور جو سننے لگے سر دھننے لگے اور اس کی محبت میں ایسے سرمست و سرشار ہوئے کہ اب اس کے وضو کا پانی بھی زمین پر نہیں گرنے پاتا، گرنے سے پہلے وہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور چہروں پر ملتے ہیں، اب اس کا ہر بول بانسری کی سریلی آواز سے بھی زیادہ دلکش و سرور بخش معلوم ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عم محترم سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ چبانے والی اور ناک کان کاٹ کر اس کا ہار پہننے والی ہندہ بھی خدمت میں حاضر ہوتی ہے اور آپ کی آواز پر لبیک کہتی ہے تو کہتی ہے: اے اللہ کے رسول! آج سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ سے زیادہ کوئی خیمہ مجھے مبغوض اور دل کو جلانے والا نہیں تھا اور آج کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ سے بڑھ کر کوئی خیمہ مجھے محبوب، دل کو ٹھنڈک اور آنکھوں کو سرور بخشنے والا نہیں۔

ضعیفوں، مسکینوں، یتیموں، بیماروں کے ساتھ حسن سلوک اور مدارات کی جو ہدایتیں اس ہادی کی لائی ہوئی کتاب اور خود اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں ملتی ہیں، وہ اس کثرت سے ہیں کہ جمع کی جائیں تو خود ایک کتاب بن جائیں۔

بڑائی اور چھوٹائی اس عالم آب وگل کا بنیادی قانون ہے، کوئی امیر رہے گا کوئی غریب، لیکن بڑے کو چھوٹے کے دبانے کا اور امیر کو غریب کے پیسنے کا، حاکم کو محکوم کے ستانے کا کوئی حق نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سودی لین دین کو ناجائز اور پوری انسانی زندگی کے لیے ناسور بتایا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے الفاظ میں: ''آج سود در سود کے چکر میں دنیا جن مصیبتوں میں گرفتار ہوتی چلی جارہی ہے، وہ سب پر روشن ہے، غریبوں کا خون چوسنا اور اپنے اندر بجائے ہمدردی و شفقت کے سنگدلی اور بے دردی کے جذبات کو پرورش کرتے رہنا سودخوار (سودی قرض لینے والے) غریب کی قسمت کا نوشتہ ہے''۔

دنیا میں جو بڑی بڑی خونریز لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، سوچ کر دیکھئے کہ اگر بڑے بڑے سودی قرضے نہ ملتے رہتے تو یہ ہولناک اور انسانیت سوز جنگیں کبھی واقع بھی ہوسکتی تھیں۔

اس وقت پورا عالم انسانی جن خطرناک اور وحشت ناک حالات سے گزر رہا ہے، وہ ہر شخص دیکھ اور محسوس کر رہا ہے؛ لیکن راہ نجات نہیں دکھائی دیتی، دکھائی دے تو کیسے؟ ذرا غور سے کام لیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ مادہ پرستی کے جوع البقر نے آج کی ترقی یافتہ دنیا کو پھر وہیں پہنچا دیا ہے جہاں وہ بعثت نبوی سے پہلے تھی، اب اگر وہ اس بلائے بے درماں سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے تو اس کو پھر رحمت عالم کے دامن رحمت سے وابستہ ہونا پڑے گا، جس نے آگ میں کودنے والوں کو آگ سے بچانے کے لئے پتھر کھا کر دعائیں دی ہیں، اس لئے کہ پیغمبر ہی انسانی جہاز کے ناخدا ہیں، انسانوں کی کشتی ہر زمانہ میں انہیں کی ناخدائی سے ساحل تک پہنچی ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے الفاظ ہیں: ''یہ صرف حضرت نوحؑ کے فرزند ہی کی خصوصیت نہ تھی، ہر زمانہ میں جس نے بھی دعویٰ کیا کہ: ''سَآوِیْ إِلَیٰ جَبَلٍ یَعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَاءِ'' [ہود: ۴۳] (میں تو پہاڑ پر پناہ لے کر طوفان سے محفوظ رہ جاؤں گا) اس کو یہی جواب ملا: ''لَاعَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللّٰہِ'' (آج کوئی بچانے والا نہیں)۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد افراد اور قوموں، اہل مشرق اور اہل مغرب، اولین و آخرین سب کے لیے اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ سعادت و فلاح انھیں کے دامن سے وابستہ ہے، ان سے علیحدہ ہو کر شقاوت و ہلاکت اور محرومی و نامرادی کے سوا کچھ نہیں''۔

☆☆☆☆☆

نگاہِ بصیرت

دورِ حاضر کے چیلنج کا مقابلہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ناسازگار ماحول ہمارا اصل میدان ہے، اور ہم سب ایک ہی جیسے مصائب و آلام کا شکار ہیں، اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم برے زمانہ میں پیدا ہوئے، حالات حد درجہ خراب ہیں، مشکلات ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، لیکن میں اس کے برخلاف کہتا ہوں کہ ہم بڑے خوش قسمت ہیں، لائق صد مبارکباد ہیں کہ اس زمانہ میں پیدا ہوئے، کیونکہ ہم کو تھوڑی سی محنت و کوشش کے بعد بڑا ثواب اور بڑا مقام مل سکتا ہے، اگر ہم اس زمانہ میں پیدا ہوئے ہوتے کہ جب بڑی بڑی صلاحیتوں کے لوگ پیدا ہوئے تو ہم کس شمار میں آتے؟ اس وقت ان حضرات کی جوتیاں سیدھی کرنا ہمارے لیے ایک باعث فخر ہوتا، میدان عمل اور میدان کارزار میں ہمارا کچھ مقام نہ ہوتا، لیکن اس دور میں کم صلاحیتوں کے باوجود بہت کچھ کر سکتے ہیں، اور حقیقتاً کام کرنے کا لطف بھی ایسے ہی زمانہ میں ہے، کیونکہ جب باد مخالف کے تھپیڑے اور مخالف موجوں کا زور نہ ہو تو کیا لطف و مزہ ہے۔

ایک مثال

مثلاً ایک تیراک اگر ایسے دریا میں تیرے جس کی سطح ساکن ہو، بہاؤ نہ ہو، بلکہ ٹھہراؤ ہو تو اس کو اس میں کوئی لطف نہ آئے گا، نہ ہی کچھ لذت حاصل ہوگی، بلکہ جلد تھک جائے گا، لیکن اگر یہی تیراک ایسے پانی میں تیرے جہاں اسے موجوں سے لڑنے اور بہاؤ کے خلاف تیرنے کا موقع ملے تو لطف بھی اٹھائے گا، اور فرحت بھی محسوس کرے گا۔

پرسکون زندگی

بالکل اسی طرح اگر زندگی پرسکون ہو، کشمکش و خطرات سے پاک ہو تو کیا مزہ؟ اصل مزہ خطرات سے لڑنے، کشمکش سے دوچار ہونے اور مصائب سے مقابلہ کرنے میں ہے، کسی شاعر کا قول ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے

اسی پر وحشت شاعر کا شعر یاد آیا کہ ؎

کچھ سمجھ کر ہی ہوا تھا موج دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا تھا عافیت ساحل میں ہے

آج دنیا میں کچھ ایسے شہر بھی ہیں جہاں کے لوگوں کو ہر طرح کا سکون و اطمینان حاصل ہے، کام بھی ان کو صرف پانچ گھنٹے دن بھر میں کرنا پڑتا ہے، لیکن ان میں خودکشی کی وارداتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں، خدا کا شکر و احسان ہے کہ اس نے ہمیں یہ ملک عطا کیا اور پھر یہ زمانہ دیا۔

عبقری لوگوں کی کمی

آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ مقامات جہاں موسموں کا اعتدال پایا جاتا ہے، وہاں جینئس قسم کے لوگ کم ہی پیدا ہوئے ہیں، عام طور پر قوت ارادی اور قوت عمل کم ہوتی ہے، دوسری طرف عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو آسمان دنیا پر تابندہ ستارہ بن کر چمکے، اور جنھوں نے غیر فانی نقش چھوڑے ہیں، وہ عام طور سے غریب لوگ تھے، اور غریب گھرانوں کے پروردہ تھے، یورپ سے لے کر ایشیا تک یہی ہے، اب اس بات کو محسوس کیا جا رہا ہے اور اس پر بڑی تحقیق ہو رہی ہے کہ اب ایسے جینئس انسان کیوں پیدا نہیں ہو رہے ہیں؟ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ زندگی اتنی آسان ہوگئی ہے کہ قوت ارادہ اور قوت عمل کمزور ہوتی جا رہی ہے۔

تعلیم ہی کو لے لیجیے، پہلے تعلیم کس طرح حاصل کی جاتی تھی؟ کتابوں کا ملنا دشوار تھا، چراغ مشکل سے دستیاب ہوتے تھے، اساتذہ کی تلاش میں جگہ جگہ کی خاک چھاننی پڑتی تھی، ایک کتاب کو دس دس حصوں میں تقسیم کر کے پڑھایا جاتا تھا، علماء نان بائیوں کی دکان پر جا کر صرف خوشبو سونگھ کر اپنی بھوک پر قابو پایا کرتے تھے، اور پھر جینئس علماء وجود میں آتے تھے، اب تعلیم سہل تر ہوگئی ہے اور علماء مفقود، اور ہیں بھی تو نہ ہونے کے برابر۔

عزم کی قوت

جس طرح پتھروں کو ٹکرا ٹکرا کر شعلہ پیدا کیا جا سکتا ہے، اسی طرح انسانی عزم بھی مخالف قوتوں سے ٹکرا کر ہی اُبھرتا ہے، یہ زمانہ، یہ ملک، یہ ماحول ماتم کے لیے نہیں، بلکہ مسرت اور شادمانی کا موقع ہے کہ ہم تھوڑا کریں اور بہت پائیں، ہمارے بہت سے ساتھی یہ سوچتے ہیں کہ پاکستان یا کسی عرب ملک چلے جائیں، یہ بڑی نادانی ہے، ہمیں اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنا چاہیے، کیونکہ زندگی استحقاق کا نام ہے، عجز و عاجزی کا نام نہیں۔

ہندوستان میں تین باتوں کی اشد ضرورت

اس وقت ہندوستان میں تین باتوں کی اشد ضرورت ہے، اور یہی ایسی ضرورت ہے جس کو انجام دے کر ہم خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل کر کے کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو سکتے ہیں:

۱-مسلمانوں میں دینی احساس وشعور پیدا کرنا اور خدا سے ان کے تعلق کو جوڑنا، یہی اصل بنیاد ہے، اور یہ اس فیصلہ کے ساتھ کیا جائے کہ ہم کو اسلام پر مرنا اور جینا ہے، ہم کوئی بھی کام کریں، تعلیمی ہو یا اقتصادی، مسلمان ہونے کے احساس اور مسلمان رہنے کے فیصلہ کے ساتھ کریں۔

دولت آفرینی کے جنون سے کوئی جگہ خالی نہیں، ہر جگہ دولت پرستی، دولت آفرینی اور مادیت کا جنون شباب پر ہے، ان حالات میں ضروری ہے کہ ہم مسلمان ہوں، ہم میں خدا سے تعلق پیدا کرنے کی تڑپ ہو، وہ تڑپ جو ہم سے پہلے مسلمانوں کو دیوانہ وار پھرایا کرتی تھی، اب ہم میں وہ تڑپ نہیں، مثلاً کھانے کی لذت کھانے میں نہیں بلکہ آپ میں قوت ذائقہ ہو، وہ اشتہا جو چاہیے، اگر اشتہا نہ ہو کسی کھانے میں کچھ فرق نہیں، ہمارے اندر جو چیز کم ہے، وہ اشتہا ہے، اگر اشتہا پھر جاگ اٹھے تو ہم ویسے ہی دیوانہ وار گھومیں۔

۲-دوسرا مسئلہ مسلمانوں کی تعلیم کا ہے، یہ بڑا اہم ہے، اگر مسلمانوں نے اپنی دینی تعلیم کو اپنے اندر برقرار نہ رکھا، تو موجودہ نظام تعلیم مسلمانوں کو علم و ہدایت سے محروم کر دے گا، اور ہمارے ہاتھوں ہماری مسلم نسل مفقود ہو جائے گی، موجودہ نظام تعلیم خالص برہمنی اور مادیانہ ہے، اس کو پڑھ کر ان بچوں کا کیا ذہن بنے گا جو مستقبل کے رہبر بننے والے ہیں؟ رائے عامہ بہت بڑی طاقت ہے، ہمیں اس کے خلاف احتجاج کرنا ہے، ہندوستان میں اسلام کو باقی رکھنے کے لیے ابتدائی مکاتب اور پرائمری مکاتب کا جال بچھانا ہوگا، دینی تعلیمی کانفرنس اس سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔

۳-تیسرا مسئلہ ہماری فکری و ذہنی تربیت کا ہے، صالح انسانوں سے رابطہ پیدا کر کے بزرگان دین کی مصاحبت سے فکری و ذہنی تربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اس تربیت کے اثرات فوری نہیں ہوتے، مثلاً جب زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے تو ابتدائی مراحل میں اس کے کچھ اثرات نہیں ملتے، لیکن بعد میں وہی ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

صرف ایک ہی راہِ نجات

مولانا ابوالکلام آزادؒ

آج سب کچھ چھوڑ کے تم سے ایک یہی آخری بات کہنا چاہتا ہوں، اور یقین کرو کہ اس کے سوا جو کچھ کہا جاتا ہے، اگر وہ اس بات کے لیے نہیں کہا جاتا تو سب کچھ بیکار ہے، اور اس میں تمہارے لیے کوئی برکت وامن نہیں، سو یاد رکھو اور ماننے کے لیے جھک جاؤ کہ تمہاری زندگی کا ہر عمل بیکار ہے، اور تمہاری فکروں کی ہر فکر گمراہی وضلالت ہے۔ تمہارے لیے صرف ایک ہی راہ نجات ہے اور بغیر اس کے کسی طرح چھٹکارا نہیں، تم جب تک اس پہلی منزل سے نہ گزرو گے اس وقت تک خدا کا قہر تم پر سے ٹھنڈا نہ ہوگا، اور تم کبھی مراد اور خوشحالی نہ پاؤ گے، تمہارے سفر عمل کا پہلا قدم یہ ہے کہ توبہ کرو، توبہ کرو، اپنی تمام قوتوں اور تمام طاقتوں کے ساتھ خدا کے آگے جھک جاؤ، اس کے آگے اس طرح گرو اور اس طرح روؤ اور اس قدر تڑپو کہ اسے تم پر پیار آ جائے، اور وہ تمہیں پہلے کی طرح پھر اپنی گود میں اٹھالے، اور سب کچھ تمہیں دے دے، جس طرح کہ سب کچھ تمہیں بخش دیا تھا، تم نے غفلت کو خوب آزمالیا، تم نے نافرمانیوں کی صدیوں تک کڑواہٹ چکھ لی، تم نے گناہ اور معصیت کے پھل سے اچھی طرح اپنے دامن بھر لیے، تم نے دیکھ لیا کہ ایک خدا کی چوکھٹ سے تم نے سرکشی کی اور کس طرح ساری دنیا تم سے سرکش ہو گئی، ایک اس کے روٹھنے سے کس طرح تمام دنیا تم سے روٹھ گئی، پس مان جاؤ اور اب بھی باز آجاؤ، گناہوں کو آزما چکے۔

آؤ! تقویٰ اور راست بازی کو بھی آزمالیں، سرکشیوں کو چکھ چکے، آؤ! طاقت کا مزہ بھی دیکھیں، غیروں سے رشتہ جوڑ کر تجربہ کر چکے، آؤ! کسی ایک سے پھر کیوں نہ جڑ جائیں، جس سے کٹ کر ذلتوں اور خواریوں، ٹھوکروں اور ماندگیوں کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا! ☆☆☆

راہِ عمل

تعاون ورواداری-اجتماعی کامیابی کا راستہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے اپنے دل میں وسعت اوراس کے معاملہ میں رواداری اور لحاظ کا رویہ اختیار کرے، اس سے محبت کے ساتھ پیش آئے ، اس کا جواجتماعی اور اخلاقی حق ہے اس کو پورا کرے، اس سے رائے کا اتفاق ہوتو ظاہر ہے کہ دونوں میں توافق و یکجہتی خود بخود پیدا ہوگی ،لیکن اگر رائے کا اختلاف ہے تو پھر اس کی ضرورت ہے کہ رواداری، برداشت اور لحاظ کا معاملہ اختیار کیا جائے اور یہی وہ موقع ہوتا ہے جہاں ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے حق اخوت کی ادائیگی کا امتحان ہوتا ہے ۔مسلمان کو اس سلسلہ کی ہدایت اور رہنمائی اس کے مذہب اورعلم الاخلاق دونوں کی طرف سے ملی ہے، اور دیگر قوموں کے افراد نے صرف علم ومطالعہ سے ان اخلاقیات کی ضرورت محسوس کی ہے ،لیکن مسلمان اس کے باوجود اس سلسلہ میں کمزور اور کوتاہ ہیں، اور ترقی یافتہ قومیں اپنی اجتماعی زندگی کی ان اخلاقیات پر خاصی حد تک عامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم کو ان ترقی یافتہ قوموں کی اجتماعی زندگی میں نظم وتوافق کی نمایاں مثالیں ملتی ہیں، اوران کی اس خصوصیت کی بنا پر ان قوموں میں اجتماعی یک جہتی اورنظم وضبط کا بڑا اظہار ہوتا ہے اور یہ ان کی طاقت اور دنیاوی کامیابی کا بڑا راز ہے۔

اس کے برعکس مشرق کی ترقی پذیر قوموں میں اور خاص طور پر مسلمان ملکوں اور ان کے معاشروں میں ایسی پراگندگی ، انتشار واختلاف نظر آتا ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرسکتا ہے کہ یہ سب ایک دوسرے کے مخالف اور دشمن ہیں، اور صرف کسی دباؤ ومجبوری کی بنا پر اکٹھا رہتے ہیں، لیکن ان کے دل ودماغ ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں، کیونکہ جہاں چار آدمی اکٹھا ہوئے اور انھوں نے کسی کام کے سلسلہ میں تعاون کا منصوبہ بنایا تو تھوڑی ہی مدت میں ان میں اختلاف شروع ہوجاتا ہے، جو بعض وقت کھلے تصادم تک پہنچ جاتا ہے، اور پھر کم از کم ایک دوسرے سے علیحدگی پر ختم ہوتا ہے، یہ وہ مرض ہے جس نے مسلمان معاشروں کو بالکل کھوکھلا کر دیا ہے، اس کی ایک وجہ تو خودرائی اور خود پسندی ہے جو ایک عام مرض کی طرح مشرقی معاشروں اور مسلمانوں میں پھیل چکی ہے، دوسرے اپنے ذاتی فائدوں کو اجتماعی اور قومی فائدے پر ترجیح دینے کی کمزوری ہے، جو ایک طرح سے عام مزاج بنتی جارہی ہے، ہر شخص اپنی رائے کو صرف صحیح ہی نہیں سمجھتا بلکہ آخری حد تک صحیح سمجھتا ہے ، پھر اس سے مختلف رائے خواہ قریبی دوست کی طرف سے یا اس کے ہمسر اور ساتھی کی طرف سے ہی کیوں نہ ہو لائق توجہ نہیں سمجھتا، اسی طرح اگر کسی معاملہ میں کوئی ذاتی مفاد ہوتو اس کے حصول کی خاطر اجتماعی اصول، اخلاقی تقاضا، اور قومی مصلحت سب کو نظر انداز کر دیتا ہے، یہ بات زندگی کے اکثر معاملات میں ہوتی ہے، خواہ وہ عام دنیاوی معاملات ہوں یا اخلاقی دینی اور عام انسانی معاملات ہوں، خواہ اس کی وجہ سے اجتماعیت کا شیرازہ بکھرتا ہو، اور دو دوستوں ، دو ہم مذہب بھائیوں ، دو متفق المقصد ساتھیوں کے درمیان جدائی پیدا ہوتی ہو، چنانچہ مسلمانوں کی اجتماعی وحدتیں قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد انتشار اور شکستگی کا شکار ہونے لگتی ہیں، اور ایک اتحاد کئی اتحادوں میں ، ایک ادارہ کئی ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے، اور پھر اس کے ٹکڑوں کے ٹکڑے ہونے لگتے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ اجتماعی مرض صرف ان کے غیر تعلیم یافتہ طبقوں ہی میں نہیں بلکہ تعلیم یافتہ طبقوں میں بھی یکساں طریقے سے پایا جاتا ہے، اور باوجود شعور کی بیداری کے اس میں کمی نہیں ہو رہی ہے، یہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک بڑا خطرہ ہے، جس کو مسلمان من حیث الافراد اوران کی قیادتیں دونوں کو توجہ دینا چاہئے اور ملت کو اس کے نتائج بد سے بچانا چاہیے۔

خاص طور پر ملت اسلامیہ کی وہ اکائیاں جو سیاسی اور بین الاقوامی لحاظ سے کمزور حالت میں ہیں ان کو تو اس کی طرف بہت توجہ دینا چاہیے، ان کی جو صلاحیتیں آج آپس میں دست وگریباں رہنے میں صرف ہورہی ہیں ان صلاحیتوں سے وہ ملت کے افراد اور جماعت دونوں کو غیر معمولی فائدہ پہنچا سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو عموما افراد کی خودرائی اوران کی ذاتی مصلحتوں کی طلب کے نتیجہ میں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں، اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دیتے ہیں

اوران نقصانات کو قبول کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں جوملت کو نیچے کردیتے ہیں اورافراد کی متوقع ترقی کو بھی روک دیتے ہیں۔

اگر مسلمان اپنی اجتماعی زندگی میں برداشت کے اصول کو اپنالیں تو مذکورہ بالاخرابی کی بہت کچھ روک تھام ہوسکتی ہے، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا ہمسر اور برابر کا صرف اپنی زبان ہی سے نہ سمجھے بلکہ عمل سے بھی سمجھے، اس کی مصلحت کو اپنی مصلحت کے مساوی سمجھے، اگر دونوں کی رایوں میں یا مصلحتوں میں کہیں اختلاف رائے ہوتو اس کو خوش اسلوبی سے حل کرے، یاایک کودوسرے پر نہ ترجیح دے، بلکہ اس پر افتراق ومخاصمت کونوبت حتی الوسع نہ آنے دے، اگراس کی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے رہنمائی حاصل کی جائے تو بہت اصلاح اور بہتری پیدا ہوسکتی ہے اور پھر ملت صرف ترقی ہی نہیں کرے گی بلکہ اس کی نیک نامی اوراچھی شہرت بھی ہوگی، اورملت کی ترقی اور شہرت کا فائدہ ملت کے افراد ہی کو پہنچے گا۔

غزوۂ احد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کہ مدینہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، یا مدینہ سے نکل کر دشمن کو باہر ہی سے روکا جائے اور شکست دی جائے، تو مختلف رائے آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے کو نظر انداز کرکے اپنے اصحاب کی رائے پر باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا ارادہ فرمالیا اور تیاری مکمل کرلی، بعض کی رائے پھر یہ ہوئی کہ مدینہ میں رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے، تب آپؐ نے فرمایا کہ یہ مناسب نہیں کہ طے کرلینے کے بعد پھر تغیر کیا جائے، اب یہی رائے ٹھیک ہے۔

دیگر موقعوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قابل مشورہ باتوں میں متعدد بار اپنی رائے پر اپنے صحابہ کی رائے کو ترجیح دی، لیکن جب وحی الٰہی سے یا اندرونی یقین واعتماد سے کسی بات کا آپ نے فیصلہ فرمایا تو اس میں خواہ تمام صحابہ مختلف رائے رکھتے ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رائے پر ہی عمل فرمایا جس کی مثال صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔

اجتماعی زندگی کا تقاضا تعاون اور رواداری سے چلتا ہے کہ ہم دوسرے کی بات کو اگر قبول نہ کرسکیں تو بہر حال اس کی مخالفت اور عداوت نہ شروع کردیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو محبت اور تعاون کی فضا ہی کو برقرار رکھیں، اس سے اجتماعی اتحاد واتفاق باقی رہتا ہے اور ملت کامیابی کے راستہ پر چلتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا عمار احمد الٰہ آبادی کا سانحۂ وفات

مدرسہ افضل المعارف وصی آباد، الٰہ آباد کے بانی ومہتمم مولانا عمار احمد الٰہ آبادی کا جمعرات ۸؍صفر المظفر ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۸؍اکتوبر ۲۰۱۸ء کو لکھنؤ کے پی جی آئی میں زیر علاج رہتے ہوئے انتقال ہوگیا، انا للّٰہ وانا الیه راجعون، غفر اللّٰہ له ورحمه رحمة واسعة وتقبل حسناته وخدماته العلمية والدينية۔

مولانا مرحوم اگرچہ الٰہ آباد کے رہنے والے نہیں تھے، لیکن اپنے وطن گھوسی سے الٰہ آباد میں اس طرح مقیم ہوگئے کہ وہی ان کی پہچان بن گیا تھا، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادیؒ سے تلمذ واسترشاد کا خصوصی تعلق تھا، ان سے مولانا مرحوم کو حدیث شریف کی اجازت اور خلافت بھی ملی تھی، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی رحمہ اللہ کے بعد عارف باللہ حضرت مولانا محمد احمد پرتاپگڑھی سے تعلق قائم کیا، اورانہوں نے تحریری طور پر آپ کو اجازت وخلافت عطا کی، حضرت پرتاپگڑھی رحمہ اللہ کی مفصل سوانح حیات لکھنے کا بھی آپ کو شرف حاصل ہوا، مولانا مرحوم جب لکھنؤ تشریف لاتے تو دار العلوم ندوۃ العلماء ضرور تشریف لاتے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خدمت میں لکھنؤ اور رائے بریلی میں بھی حاضر ہوتے، ان کی تدفین الٰہ آباد میں ہوئی، عمر اسی (۸۰) سال کے قریب ہوگی، مولانا افضال احمد قاسمی ان کے صاحبزادے ہیں، جو ان کے قائم کردہ مدرسہ کے ذمہ دار ومہتمم ہیں۔

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے ان کے صاحبزادہ کو ایک تعزیتی مکتوب لکھ کر روانہ کیا، اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے مولانا سلطان الہدیٰ ندوی اور مولانا شہاب الدین ندوی کو تعزیت کے لیے الٰہ آباد بھیجا۔

اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل دے، آمین۔ ☆☆☆

قانون فطرت

طاقت وقوت کا غرور

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

ہم اس وقت ایک ظالم اور متکبر بادشاہ کے سامنے ہیں، ایک ایسے سرکش حکمراں کے سامنے جس کی آنکھوں پر تکبر وسرکشی کی غلیظ چادر چڑھی ہوئی ہے اور جو اپنی حماقت اور کند ذہنی کی وجہ سے خدائی کا دعویدار ہے اور "أَنَا رَبُّكُمُ الأَعْلَىٰ" کا اعلان کررہا ہے، یہ اپنے وقت کا سب سے بڑا سرکش اور ظالم و متکبر بادشاہ فرعون ہے۔

فرعون سرزمین مصر کا حکمراں، جس نے پوری قوم کو غلام بنا رکھا ہے اور رعایا کو انتہائی بے دست وپا سمجھ کر ذلت وغلامی کے بندھن میں جکڑنا چاہتا ہے، وہ فرعون جو اشرف المخلوقات انسان کو جانور سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں، اور جس نے دنیا میں اپنے زمانے کی سب سے عظیم امت اور اپنے وقت کی بلند وبرتر قوم بنی اسرائیل کو ہمیشہ کے لئے قعر مذلت میں ڈھکیل دینے کے لیے پوری قوت صرف کردی ہے، وہ ایک نبی کی اولاد کو ذلیل و رسوا کرنا چاہتا ہے، اور اس کے لئے وہ اپنے آخری حربہ کو استعمال کررہا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو فرعون کی یہ سرکشی، اس کا استکبار اور اس کی حماقت پسند نہیں آئی، اس نے چاہا کہ اس قوم کو عزت وبلندی کے اس مرتبہ پر قائم رکھے جو ان کا حق تھا اور غلامی اور ذلت کی تاریکیوں سے نکال کر ایک ایسی روشنی ان کو عطا کرے جو رہتی دنیا تک باقی رہے، اور جو آنے والی قوموں کے لیے مشعل ہدایت بن سکے، چنانچہ اس روشنی کا سب سے پہلا نور اسی قوم کے ایک نومولود بچے کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا، جن کا نام موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام مختلف آزمائشوں اور امتحانات سے گذرنے کے بعد اب نور نبوت سے سرفراز ہوچکے ہیں۔ رحمت الٰہی ان پر سایہ فگن ہیں، وہ فرعون سے مقابلہ کرنے کے جذبے سے سرشار ہیں، ظلم وتکبر کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہیں اور انسان کو اس کے حقیقی مرتبہ پر واپس لانے اور غلامی کی زنجیر سے نجات دلانے کے لیے پوری طرح کمربستہ، اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت کی امانت عطا فرمائی اور ہر موقع پر اپنی مدد ان کے ساتھ رکھی، اور بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کی ذمہ داری ان کے سپرد کردی اور اپنی پوری مدد کا ان کو یقین دلایا۔

یقین کی بے پناہ قوت اور ایمان کے جذبہ سے سرشار ہوکر حضرت موسیٰ علیہ السلام ظالم فرعون کے دربار میں پہنچے اور اس سے قوم کو آزاد کرنے کا مطالبہ کیا، ایمان کی دعوت دی اور خدائے واحد کو معبود ماننے کا مطالبہ کیا۔

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی یہ جرأت دیکھ کر کہا کہ اے موسیٰ! کیا تم وہی شخص نہیں ہو جس کی ہم نے بچپن میں پرورش کی اور تم ایک مدت تک یہاں مقیم رہے، اس کے باوجود جو کچھ تم نے کیا وہ کسی سے مخفی نہیں ہے، بلکہ وہ سراسر کفران نعمت ہے، احسان ناشناسی ہے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے تلخ لہجے میں فرمایا کہ بنی اسرائیل کو تم نے غلام بنالیا، یہی وہ تمہارا احسان ہے جسے تم جتا رہے ہو، اے اللہ کے بندوں کو غلام بنانے والے ظالم حکمراں! تو نے میری قوم کو غلام بنایا، ان کو حقیر سمجھا اور طرح طرح سے ان کی توہین کی، کیا یہی تیرا وہ عظیم احسان ہے جو تو یاد دلا رہا ہے اور احسان مند ہونے کا مطالبہ کررہا ہے۔؟!

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی حق گوئی سے فرعون کا دربار گونج اٹھا، اور فرعون کی خدائی لاجواب ہوکر رہ گئی، لیکن سلطنت کے غرور اور عزت وعظمت کے نشہ نے فرعون کے اندر انتقام کی آگ بھڑکادی، اس کے درباریوں نے اس آگ کو مزید ہوا دی، لوگوں نے کہا کہ کیا آپ موسیٰؑ اور ان کی قوم کو اسی طرح چھوڑ دیں گے، تاکہ وہ زمین میں فساد برپا کریں اور وہ آپ اور آپ کے معبودوں سے منہ موڑ لیں۔

فرعون نے جواب دیا کہ وہ دن دور نہیں جب کہ ہم ان سے اس کا انتقام لیں گے اور ان کی عورتوں کو چھوڑ کر ان کے تمام مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے اور ان کو ہماری بالادستی کے سامنے جھکنا پڑے گا۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قوم فرعون کی یہ دھمکی سن کر گھبرا گئی، حضرت موسیٰؑ نے ان کو اطمینان دلایا اور ان سے کہا کہ تم لوگ اللہ سے مدد طلب کرو اور صبر کرو اور یہ بھی یاد رکھو کہ زمین اللہ کی ہے، وہ جس کو چاہے اس کا وارث بنائے اور نیک انجام تو

ہمیشہ اللہ سے ڈرنے والوں کا رہا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ایمان کی قوت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ فرعون کے جادوگروں نے جو خالص فرعون کے پروردہ اور اس کی رعایا تھے، اور فرعون کی خدائی اور اس کی ربوبیت کے معترف تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے، انہوں نے بھی مقابلہ کی تاب نہ لا کر فرعون کے بھرے دربار میں صاف صاف اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے : ''جادوگر سجدے میں گر گئے اور انہوں نے کہا کہ ہم رب العالمین پر ایمان لائے جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے''۔

فرعون یہ کیفیت دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا اور اس نے جادوگروں کو دھمکی دی کہ تم نے اس شہر کے لوگوں کو نکالنے کی سازش کی ہے تو اس کا انجام تم کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ تمہارے ہاتھ پیر مخالف سمت سے کاٹ دوں گا اور تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔

ایمان لانے والے جادوگروں نے نہایت بہادری اور جرأت کے ساتھ صاف صاف یہ اعلان کر دیا کہ: ''تم کو جو کچھ کرنا ہو کر لو، زیادہ سے زیادہ تم ہماری اس دنیاوی زندگی کا خاتمہ کر دو گے، ہم تو اپنے رب سے ملنے والے ہیں''۔

اس کے بعد فرعون کا جو حشر ہوا وہ کسی سے مخفی نہیں، یہ مختصر سی کہانی ہے ایک ابھرتی ہوئی قوم کے مٹنے اور مٹتی ہوئی قوم کے ابھرنے کی، جو عبرتوں سے لبریز ہے اور جس میں قوموں کے عروج و زوال کی پوری تاریخ موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

حسین رضؓ نام ہے پیکرِ حق پرستی کا

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

عشرۂ محرم گزر گیا، تعزیہ داری اور سوز خوانی کی چہل پہل ایک سال کے لیے رخصت ہو گئی، کیا آپ کے دل سے حسینؓ کی یاد رخصت ہو گئی؟ کیا آپ کے ذہن نے بھی واقعات کربلا کو بھلا دیا؟ کیا آپ بھی ایک سال تک حسینؓ اور کربلائے حسینؓ کو بھولے ہوئے رہیں گے؟ کیا تاریخ اسلام کے لیے اس اہم ترین واقعہ، اور قربانی وایثار، شہادت و جانبازی کے اس نادر نمونہ کی وقعت واہمیت آپ کے دل میں صرف اسی قدر ہے کہ اسلامی سال کے شروع میں گنتی کے چند روز اس کی یادگار میں چند رسمیں منالی جائیں؟ وہ جسد اطہر جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پلا تھا، اور جسے آگے چل کر جوانانِ جنت کا سردار بننا تھا، اس کے خاک میں تڑپنے اور خون میں لوٹنے کی وقعت کیا آپ کی نظر میں بس یہیں تک ہے کہ سال بھر میں محض ایک ادائے رسم کے طور پر ایک مرتبہ بغیر اپنے دل ودماغ کو حرکت میں لائے، اس داستان کو سن لیا کریں؟

کیا آپ کا دل حسینؓ کی محبت سے، حسینؓ کی عظمت سے، اور حسینؓ کی عقیدت سے خالی ہے؟ اگر خدانخواستہ ایسا ہے، تو آپ کو سچائی کی قدر نہیں، حق پرستی عزیز نہیں، اور آپ کے دل میں حلاوت ایمان کا گزر نہیں، حسینؓ چند ذرات ارض کے مجموعہ کا نام نہیں، حسینؓ ایک مشت خاک کا نام نہیں، حسینؓ نام ہے پیکر حق پرستی کا، مجسمہ ایمان وایقان کا، اور معنی صبر وشہادت کا، جس کے دل میں اس پیاری اور دلکش شخصیت کے نام سے سوز وگداز کی کوئی لہر نہیں اٹھتی، اسے نہ سچائی کی قدر ہے، نہ اسے حق پرستی عزیز ہے، اور نہ اس کے دل میں قربانی اور شہادت کی کوئی وقعت ہے، ایمان تو بڑی لطیف ونازک چیز ہے، اس کا گزر ایسے درشت وکرخت دل کے اندر کیسے ہو سکتا ہے، پس حسینؓ کی محبت بدعت نہیں، جزو ایمان ہے، واقعہ کربلا کا ذکر کرنا تاریخ اسلام کی بہترین روایت کا درس دینا ہے، شہید کربلا کی یاد کا زندہ رکھنا، اپنے جذبۂ ایمان کا زندہ رکھنا ہے۔

☆☆☆

فکر معاصر

انسانی حقوق - نظریات اور حقائق

● ....مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

کوئی بھی حساس اور خوب وناخوب کی تمیز کی صلاحیت کا حامل تجزیہ نگار، بین الاقوامی پالیسی سازوں کے وضع کردہ انسانی حقوق کے پیمانوں کو مدنظر رکھ کر موجودہ صورتحال کا جائزہ لے گا تو اسے انسانی حقوق کی پامالی کی مثالیں دنیا کے تمام ممالک میں ملیں گی جن میں سرِ فہرست انسانی حقوق کے دعویدار متمدن ممالک ہیں۔

اقوام متحدہ نے انسانی حقوق کا چارٹر تیار کیا اور اس کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کو روکا جاسکے اور ضرورت پڑنے پر کارروائی کی جاسکے۔ گذشتہ زمانہ میں بھیانک جنگیں ہوا کرتی تھیں جن کے نتیجہ میں بھاری جانی و مالی نقصان ہوتا تھا جس کی بدترین مثال روم و فارس کی جنگیں ہیں، شام کا علاقہ بھی میدان جنگ بنا ہوا تھا، وہاں کے باشندوں کو زبردست نقصان کا سامنا کرنا پڑا جن میں یہود ونصاریٰ بھی تھے۔

موجودہ ترقی یافتہ اور متمدن دور میں بھی یوروپی ممالک کے درمیان دو عظیم جنگیں ہوئیں اور انقلابات رونما ہوئے، جس کا سب سے زیادہ برا اثر عالم اسلام پر پڑا، دونوں عظیم جنگوں کو دیکھنے والے اس کے جانی و مالی نقصانات اور تباہ کاریوں سے بخوبی واقف ہیں، ان جنگوں نے فرانس، برطانیہ اور دیگر یوروپی ممالک کو اس حد تک کمزور کردیا کہ ان کو اپنے مقبوضات سے دست بردار ہونا پڑا۔

جنگِ عظیم کے بعد اشتراکی انقلاب برپا ہوا، جس نے سویت یونین کے نام پر تمام ممالک کو ایک نظام کے تحت لانے کی ناکام کوشش کی، چین میں بزورِ طاقت اشتراکی آئیڈیالوجی تھوپنے کے سلسلہ میں لاکھوں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا گیا، مخالفین کو سلاخوں کے پیچھے ڈال دیا گیا، سویت یونین کے مقبوضہ ممالک میں دینی شعائر وآثار کو مٹانے اور ملحدانہ نظریات تھوپنے کے لیے ہر طریقہ کو جائز سمجھا گیا، خصوصاً مقبوضہ اسلامی علاقوں میں تو اسلامی شعائر کو چن چن کر ختم کیا گیا۔

پھر یہی اشتراکی آئیڈیالوجی ایشیا وافریقہ کے اسلامی عربی ممالک میں پہنچی جہاں کی حکومتوں نے اس آئیڈیالوجی کو نافذ کرنے کے لیے انسانی حقوق کی بدترین پامالی کی، تحریکات پر پابندی لگائی، آوازوں کو دبایا اور مخالفین کو تختہ پلٹنے کے جھوٹے الزام میں جیلوں میں ڈال دیا، اٹلانٹک سے لے کر خلیج تک یہی رویہ اپنایا گیا، افریقہ چور اور ڈاکوؤں سے بھر گیا، جن کا شکار اہلِ حق اور رفاہی تنظیمیں بنیں، ان کو عقوبت خانوں کی المناک آزمائشوں سے گزرنا پڑا، دیگر ممالک کے مقابلہ میں اسلامی ممالک اور وہاں کے اہلِ حق نے زیادہ ظلم واستبداد کا سامنا کیا، لیکن ظلم وستم کا یہ دور باقی نہیں رہا اور ظالم وجابر حکمراں تاریخ میں گم ہوگئے، جس پر تاریخ کے صفحات شاہدِ عدل ہیں۔

انسانوں کو خوشحالی اور امن وامان فراہم کرنے میں اشتراکیت کی ناکامی کے بعد یہ امید تھی کہ عالمِ اسلام اس تجربہ سے سبق سیکھے گا، لیکن حالات اس کے برعکس ہیں، ان ممالک میں بھی جہاں فوجی انقلابات ہوئے اور ان ممالک میں بھی جہاں فوجی انقلابات نہیں ہوئے، تمام اسلامی ممالک اس روش پر گامزن ہیں اور بیرونی طاقتوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے ہوئے ہیں، انسانی حقوق کی پامالی عروج پر ہے، آزادیٔ رائے پر قدغن لگائی جارہی ہے۔

اشتراکیت کے سقوط اور سامراج کی رخصتی کے باوجود مغربی ممالک کی پالیسی میں تبدیلی نہیں آئی، ان کی پالیسی سے ایسا لگتا ہے کہ وہ دوبارہ قدرتی ذخائر سے مالا مال اسلامی علاقوں میں تسلط قائم کرنے کے فراق میں ہیں، بلکہ حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے ہیں کیونکہ پہلے مغرب کی ریشہ دوانیاں علانیہ ہوا کرتی تھیں اور اب نہایت ہی منظم انداز میں خفیہ طور سے ہوتی ہیں، کانوں کان کسی کو خبر تک نہیں ہوتی، آوازوں کو دبایا جاتا ہے، تحریکات پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، حالانکہ یہ امید تھی کہ اشتراکیت وسامراج کے بعد حالات سدھر جائیں گے اور کام کرنے کے میدان کھل جائیں گے جس سے اشتراکیت ومغربی سامراج کے باقی ماندہ فاسد اثرات کو صاف کرنے میں مدد ملے گی لیکن موجودہ صورتحال بڑی مایوس کن ہے، پھر بھی ناامید ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ صرف خدائے بزرگ وبرتر ہی کارکشا وکارساز ہے: "قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاء وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاء وَتُعِزُّ مَن تَشَاء وَتُذِلُّ مَن تَشَاء بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" [آل عمران: ۲۶] (کہو کہ اے اللہ (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

[عربی سے ترجمہ: شاداب ابراہیم ندوی]

☆☆☆☆☆

عالم اسلام

اویغور ترک مسلمانوں پر چینی کمیونسٹوں کے مظالم

مولانا سید عنایت اللہ ندوی

چین میں ایک صوبہ ہے زنجیانگ ، یہ دراصل مشرقی ترکستان کا بدلا ہوا نام ہے جو چینیوں کا دیا ہوا ہے ، مشرقی ترکستان اس عظیم ملک ترکستان کا حصہ ہے جو ایک زمانہ میں مسلمانوں کا علمی مرکز رہ چکا ہے ، جہاں امام بخاری، امام ترمذی، امام ابوداؤد رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر ائمہ حدیث پیدا ہوئے ، جنہوں نے ایسے علمی نقوش چھوڑے جو رہتی دنیا تک تشنگان علم کی پیاس بجھاتے رہیں گے ، اس خطہ کو پہلے ماوراء النہر بھی کہا جاتا تھا۔

اسی ملک ترکستان کے مشرقی حصہ پر ۱۷۵۹ء میں چین نے قبضہ کرلیا، اس وقت چین میں مانچو خاندان کی حکومت چل رہی تھی، اسی وقت سے ترکستان کا یہ مشرقی حصہ چینی غلامی کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے جبکہ ترکستان کا مغربی حصہ انیسویں صدی عیسوی کے اخیر میں روسیوں کے قبضہ میں چلا گیا جو سو سال تک روسی غلامی کے شکنجہ میں رہنے کے بعد ۱۹۹۱ء میں آزاد ہوگیا، اور وہاں ازبکستان ، قزاخستان ، تاجکستان ، ترکمانستان اور کرغیزستان کے نام سے پانچ آزاد ممالک منصہ شہود پر آگئے، لیکن ۲۶۰ رسال سے مشرقی ترکستان پر جاری چینی قبضہ بدستور برقرار ہے ، اس دوران چین میں جب شاہی نظام کا خاتمہ ہوا، اور ۱۹۱۱ء میں جمہوری انقلاب آگیا تو ۱۹۳۲ء میں مشرقی ترکستان کے مسلمانوں کے اندر چین سے مکمل علیحدگی اور خودمختاری کی تحریک اٹھی، ممکن ہے کہ وہ تحریک کامیاب ہوجاتی اور مشرقی ترکستان چینی قبضہ سے آزاد ہوجاتا، لیکن روس کی کمیونسٹ حکومت نے علیحدگی پسندوں کے خلاف چینی حکومت کی بھرپور مدد کی اور مشرقی ترکستان کو چین کے قبضہ سے آزاد ہونے نہیں دیا، کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ اگر مشرقی ترکستان چینی قبضہ سے آزاد ہوگیا تو مغربی ترکستان میں بھی آزادی کی تحریک اٹھے گی جو اس وقت روس کے قبضہ میں تھا، اس لیے روس کی کمیونسٹ حکومت نے چین کی جمہوری حکومت کی مدد کرکے مشرقی ترکستان کی آزادی کا راستہ روک دیا۔

۱۹۴۹ء میں ماؤزے تنگ نے چین میں کمیونسٹ انقلاب برپا کردیا ، کمیونسٹ انقلاب کے آتے ہی مسلمانوں کے لیے سخت ترین دور ابتلا کا آغاز ہوگیا، مسلمانوں کو نماز ، اذان جیسے شعائر اسلام کی ادائیگی تک سے روک دیا، تین لاکھ ساٹھ ہزار سے زائد مسلمان ہلاک کردیے گئے ، تیس ہزار مسجدیں بند کردی گئیں، مدارس پر تالے لگائے گئے ، طلبہ کو سرکاری اسکولوں میں منتقل کرنے پر مجبور کیا گیا ، جہاں مارکسیزم اور ماؤازم کی تعلیم دی جاتی تھی، مساجد کے ائمہ کرام کو سخت ترین اذیتیں دے کر ہلاک کردیا گیا ، ۱۹۵۱ء کے بعد لاکھوں کی تعداد میں چینی مسلمان ہندوستان ، پاکستان اور ایران میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے ، چین کا کمیونسٹ دور مسلمانوں کے لیے سابقہ شاہی دور اور جمہوری دور کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہلاکت خیز اور بلاخیز ثابت ہوا، چینی مظالم کے شکار زیادہ تر مشرقی ترکستان کے اویغور ترک مسلمان ہوئے۔

۱۹۸۰ء کے بعد چین میں کسی حد تک مذہبی آزادیاں دی گئیں، نماز پڑھنے ، اذان دینے اور حج کرنے جیسے اعمال پر جو بندش لگی تھی وہ ختم کردی گئی، البتہ یہ دباؤ بنایا گیا کہ چین میں بسنے والے سارے مسلمان اپنی مخصوص زبان وثقافت کو چھوڑ کر چینی زبان کو اپنی مادری زبان کے طور پر اختیار کرلیں اور چینی ثقافت میں ضم ہوجائیں ، چین میں بسنے والی مسلمان قوموں میں سے اکثر نے اس دباؤ کے آگے سر تسلیم خم کرلیا، لیکن اویغور ترک مسلمانوں نے اس کے آگے جھکنا پسند نہیں کیا اور اپنی ترکی زبان او راسلامی ثقافت سے ایک انچ ہٹنا قبول نہیں کیا، اس لیے فی الحال وہی چینی کمیونسٹ حکمرانوں کے نشانہ پر ہیں، طرح طرح کے ظالمانہ قوانین ان کے لیے بن رہے ہیں اور طرح طرح سے ان پر شکنجے کسے جارہے ہیں، ان کو جبراً نقل مکانی پر مجبور کیا جاتا ہے، انکے مکانات میں چینی لوگوں کو لاکر آباد کیا جاتا ہے تاکہ اس ریاست میں اویغور ترکوں کی آبادی کو اقلیت میں تبدیل کیا جاسکے، اس کوشش میں چینی کمیونسٹ کامیاب ہوتے جارہے ہیں، کیونکہ ۱۹۳۶ء میں یہاں کی سو فیصد آبادی اویغور ترک مسلمانوں پر مشتمل تھی، لیکن اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے، اب صرف ۴۶ رفیصد آبادی اویغوروں کی ہے اور چینی ہنوں کی آبادی ۴۰ ر فیصد تک پہنچ چکی ہے جو سب کے سب بدھسٹ

ہیں یا پھر کمیونسٹ، جبکہ ۱۴رفیصد آبادی ان مسلمانوں کی ہے جو دیگر قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ چین میں ۵۶رقومیں آباد ہیں، ان میں سے ۱۰رقومیں ہوئی، اویغور، قازاخ ،تاجیک ، کرغیز، تاتار، سالار ، ازبک ،تنگ شانگ اور پاؤ آن قو میں سو فیصد مسلمان ہیں، ان میں سے ہوئی مسلمانوں کی آبادی سب سے زیادہ ہے، ان دس قوموں میں سے ۹رقوموں نے چینی زبان اور چینی ثقافت کو اختیار کرلیا ہے، گرچہ وہ مذہب اسلام پر قائم ہیں، لیکن اویغور قوم نے ایسا کرنے سے انکار کردیا، انہوں نے مذہب اسلام کے ساتھ ترکی زبان سے بھی اپنی وابستگی کو برقرار رکھا ہے، اس کی سزا انہیں یہ مل رہی ہے کہ ہر طرح سے چینی کمیونسٹوں کی طرف سے ان کو ہراساں کیا جاتا ہے، کبھی روزہ رکھنے سے ان کو روکا جاتا ہے، کبھی حج کرنے سے روکا جاتا ہے، کبھی میدان میں ان کے اماموں کو کھڑا کرکے ان سے پریڈ کروایا جاتا ہے۔

ابھی ۲۴رستمبر سے یہ خبریں آرہی ہیں کہ دس لاکھ سے زیادہ اویغور مسلمانوں کو گرفتار کرکے کیمپ میں بھرتی کردیا گیا ہے، ان میں جوان، بوڑھے، عورت و مرد سب شامل ہیں، ان لوگوں پر الزام ہے کہ ان کا بیرونی ممالک سے رابطہ ہے اور وہ صوبے میں دہشت گردی، انتہا پسندی اور علیحدگی پسندی کو ہوا دیتے ہیں، جس کسی کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی بھی بیرونی ملک سے فون پر کوئی رابطہ کیا یا کسی نے اس سے رابطہ کیا تو فوری طور پر پولس اس کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اس پورے خاندان کو گرفتار کرکے کیمپ میں ڈال دیتی ہے، کیمپ میں ان کی برین واشنگ کروائی جاتی ہے، کمیونسٹ حکمرانوں سے وفاداری کا ان سے حلف دلوایا جاتا ہے، اللہ ورسولؐ کی نفرت ان کے دل میں ڈالی جاتی ہے، ان کی زبان سے یہ کہلوایا جاتا ہے کہ تمہیں روزی دینے والا (نعوذ باللہ) اللہ نہیں ہے بلکہ کمیونسٹ حکمراں ہیں، جب تک وہ اس کا عہد واقرار نہیں کرتے انہیں کیمپ سے چھوڑا نہیں جاتا نیز موجودہ کمیونسٹ صدر نے یہ فرمان بھی جاری کردیا ہے کہ کسی بھی اویغور مسلمان کے گھر میں قرآن کا کوئی نسخہ رہنے نہ دیا جائے، سارے قرآن کے نسخے ضبط کرلیے جائیں ،اس حکم پر عمل کرتے ہوئے چینی فوجی ہر گھر میں گھس کر مکمل خانہ تلاشی کرتے ہیں، جس گھر میں بھی قرآن کا کوئی نسخہ یا کوئی بھی دینی واسلامی کتاب ملتی ہے، اسے ضبط کررہے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت پر مکمل بندش لگادی گئی ہے، اویغور مسلمان مردوں کو ڈاڑھی رکھنے اور عورتوں کو برقعہ پہنے پر مکمل روک لگادی گئی ہے۔

چینی کمیونسٹ حکمراں اویغور ترک مسلمانوں کے خلاف وہی ہتھکنڈے استعمال کررہے ہیں جو میانمار کے بدھسٹ فوجی حکمراں روہنگیائی مسلمانوں کے خلاف کرچکے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ پورے مشرقی ترکستان کو اویغور مسلمانوں کے وجود سے خالی کردیا جائے جس طرح اراکان خطہ کو روہنگیائی مسلمانوں کے وجود سے خالی کردیا گیا ہے، مشرقی ترکستان (زنجیانگ) کا خطہ گیس کے ذخائر سے مالا مال ہے، اس لیے چینی حکمراں کبھی بھی اس خطہ کو آزاد نہیں ہونے دیں گے، اسی پالیسی کے تحت اس خطہ میں بڑے پیمانہ پر فیکٹریاں اور کارخانے کھولے جارہے ہیں، اور ان کارخانوں میں کام کرنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں چینی ہنوں کو لاکر آباد کیا جارہا ہے، کسی بھی اویغور کو ان کارخانوں میں ملازمت نہیں دی جارہی ہے، وہ اس کوشش میں ہیں کہ اس خطہ میں ہنوں کی آبادی ۵۰رفیصد تک پہنچ جائے تو پھر اویغوروں کا قتل عام بڑے پیمانہ پر شروع کردیا جائے، فی الحال وہ اس آنکڑہ کو حاصل کرنے کے قریب پہنچ چکے ہیں جیسے ہی وہ اس آنکڑہ کو حاصل کرلیں گے ویسے ہی وہ اویغوروں کی چینی شہریت کو منسوخ کردیں گے، پھر ان کی حالت ویسی ہی ہوجائیگی جیسی کہ روہنگیائی مسلمانوں کی ہوئی۔

چینی کمیونسٹوں نے اویغور مسلمانوں کا ماضی میں کئی بار قتل عام کیا ہے، ایک بار تو ۱۹۵۰ء میں جبکہ کمیونسٹوں نے اقتدار سنبھالا اور مسلمانوں کو شعائر اسلام کی ادائیگی سے روکا، مسلمانوں کی مخالفت پر کئی لاکھ مسلمان ہلاک کردیے گئے، پھر ۱۹۹۱ء میں جب مغربی ترکستان کا خطہ روسی قبضہ سے آزاد ہوا تو اس سے حوصلہ پاکر مشرقی ترکستان کے مسلمانوں میں بھی چین سے آزادی کی تحریک شروع ہوئی، اس کے ردعمل میں چینی فوجیوں نے اویغوروں کے خلاف فوجی کارروائیاں شروع کردیں ،چین میں کہیں بھی کوئی بم دھماکہ ہوتا ہے تو اس کا سیدھا الزام انہی اویغوروں پر لگادیا جاتا ہے، ان کے خلاف فوجی کارروائیاں شروع ہوجاتی ہیں، کئی لوگ مارے جاتے ہیں، بہت ساروں کو جیل میں بند کردیا جاتا ہے ، یہ تو ہمیشہ کا معمول ہی ہے ،کبھی کبھی بڑے پیمانے پر قتل عام بھی ہوتا ہے جیسا کہ ۲۰۰۸ء میں ۲۰۰رافراد، ۲۰۰۳ء میں ۱۵۰رسے

زیادہ افراد اور ۲۰۱۴ء میں ۱۰۰/ سے زائد افراد اویغوروں کے ہلاک کردیے گئے، آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے چینی کمیونسٹ انتہائی ظالمانہ اور وحشیانہ کارروائیاں کرتے ہیں، اب تو وہ اس منصوبہ پر عمل کررہے ہیں کہ مشرقی ترکستان کو آزادی دینے کے بجائے اس خطہ سے اویغور مسلمانوں کا ہی مکمل صفایا کردیا جائے یا تو ان کی نسل کشی کردی جائے یا پھر ان کو یہاں سے نکل جانے پر مجبور کردیا جائے۔

چین کی فوجی طاقت چونکہ دنیا کی تیسری بڑی طاقت بن چکی ہے اور وہ اقتصادی میدان میں بھی تیزی سے ترقی کررہاہے نیز وہ ویٹو پاور رکھتا ہے، اس لیے کوئی بھی ملک اسکے مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا۔

اب صرف اللہ تعالیٰ کے علاوہ کون ہے جو ان اویغور مسلمانوں کا سہارا بنے گا، اور اللہ چاہے تو ان مظلوم اویغوروں کی چینی کمیونسٹ بھیڑیوں سے حفاظت فرماسکتا ہے ورنہ ان بھیڑیوں نے تو ان مظلوموں کے مکمل صفایا کا منصوبہ ہی تیار کرلیا ہے، فی الحال دس لاکھ سے زائد مسلمانوں کو جو انہوں نے کیمپ میں بند کردیا ہے، ان میں سے کتنے بچ کر نکلتے ہیں، یہ کہنا مشکل ہے، موجودہ اندازہ کے مطابق چین کے اندر اویغور مسلمانوں کی آبادی ایک کروڑ ۳۷/ لاکھ سے زائد ہے، آئندہ چند برسوں میں انکی تعداد کتنی گھٹتی ہے، یہ کہا نہیں جاسکتا ہے، دعا ہی کرسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان مظلوم مسلمانوں کو چینی کمیونسٹوں کے شکنجہ سے آزاد کرے اور ان کی پوری پوری حفاظت فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

ایمان، اسلام اور احسان

مولانا سید محمد الحسنی رحمۃ اللہ علیہ

ایمان نہ بیچا جاسکتا ہے، نہ خریدا جاسکتا ہے، نہ مول تول کیا جاسکتا ہے، اور نہ تلوار اور پستول کے ذریعہ زیر کیا جاسکتا ہے، نہ فلسفہ وسائنس کے ذریعہ اور نہ نام نہاد کلچر کے ذریعہ اور نہ اس کنگال زوال پذیر تاریک تہذیب کے ذریعہ اور نہ خیر سے مفقود اور ایمانی نعمت سے محروم معلومات کے ذریعہ جو انسانیت کے لیے وبال بنی ہوئی ہے، اور نہ علم وادب کے پروپیگنڈوں میں اور نہ ان انقلابوں وترقیوں میں جس میں اپنا ضمیر اور اپنی جان فروخت کردی گئی اور اپنے قلم وزبان کو مادی چیزوں اور چند درہموں کے بدلہ میں فروخت کردیا گیا اور خود ہی اس سے غیر راغب تھے۔

اسلام کی روح اور اس کا پیغام یہ ہے کہ تم حالات کو بدلنے کے لیے دنیا میں بھیجے گئے ہو، حالات کے محور پر گردش کرنے کے لیے نہیں، لیکن ؎

شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں عبادت وتلاوت، معاملات و معاشرت، کسب ومعیشت، غرض کہ زندگی کے ہر موڑ اور ہر میدان میں خدا پر نگاہ رکھو، خدا سے اپنے معاملے درست رکھو، تمہاری زندگی میں کوئی جھول تمہاری معاشرے میں کوئی چیز خلاف اسلام اور تمہاری اسلامی وانسانی حقوق وتعلیمات میں خدا کی کوئی نافرمانی اور اس کے حکم کی پامالی نہ ہو۔

احسان کی سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ اس کا صلہ جلد طلب نہ کیا جائے، بلکہ بہتر یہ ہے کہ صلہ کی آرزو ہی دل میں نہ رکھی جائے، اور استقامت واستقلال کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے، اس حال میں شکوہ وشکایت اور جلد مایوسی اور بار بار روش اور مسلک کی تبدیلی اور گھبرا گھبرا کر نئے نئے راستوں پر بادہ پیمائی نہ صرف ممنوع بلکہ اس کے لیے بہت بدنمائی اور رسوائی کی بات ہے، اس سے اس بات کی غمازی ہوتی ہے کہ یہ صلاحیت ابھی اس فرد یا جماعت میں اچھی طرح پیدا نہیں ہوتی یا اس قدر محدود اور کمزور ہے کہ وقتی تاثرات اور جذبات پر بھی غالباً نہیں آسکتی اور اعصابی اتار چڑھاؤ کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتی، اس میدان میں محض صحیح راستہ پر ہونا کافی نہیں بلکہ اس راستہ پر پورا یقین بھی ہونا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

اصلاح ودعوت

منہجِ دعوت وعمل

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

یقیناً یہ خوش آئند بات ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا انتہائی فضل وتوفیق ہے کہ علماء امت کی ایک تعداد خدمت دین میں مشغول ہے، لیکن مدارس سے فارغ ہونے والے علماء کی تعداد بہت بڑی ہے، ہندوستان میں ہر سال تقریباً پندرہ ہزار فارغ ہوتے ہیں، یہ تعداد اتنی ہے کہ اگر اس میں سے دس فیصد بھی یہ طے کر لے کہ ہمیں نیابت رسول کا فریضہ انجام دینا ہے، جو ہمارے اوپر عائد ہوتا ہے تو شاید کافی ہو۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اکثر علماء جو مدارس سے فارغ ہوتے ہیں وہ اپنی اپنی راہ پر لگ جاتے ہیں، اور وہ اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کر پاتے، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ دوران طالب علمی ان کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہیں ہوتا، جس کو سامنے رکھ کر اور جس کو ٹارگیٹ کر کے وہ اپنے کو تیار کریں، یہ ایک مزاج بن گیا ہے کہ مدارس میں پڑھنے والے روٹینی انداز میں پڑھتے ہیں، وقت گذارتے ہیں، اور پھر فارغ ہو کر کہیں چلے جاتے ہیں، اسی لیے اکثر عالمیت کے آخری سالوں میں ان کو حیرت ہوتی ہے کہ اب ہم کیا کریں، اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ پہلے نہیں سوچتے کہ ہمیں کیا کرنا ہے، جو شخص پہلے اپنے لیے ایک نظام طے کرتا ہے، اس کے اعتبار سے تیاری کرتا ہے، اور پھر اس کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے، وہ کبھی حیرت وپریشانی کا شکار نہیں ہوتا، چونکہ ہمارے مدارس میں اکثر وبیشتر مقصد کی طرف توجہ جس طرح دلانی چاہیے اس کا اہتمام نہیں ہو پاتا، اس کا ایک نقصان یہ ہے کہ فارغ ہونے والے کو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔

وارثین انبیاء کا کام

اس وقت جو حالات ہیں اور اگر تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو صرف اسی وقت کیا بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ کم وبیش ہمیشہ یہ حالات رہے ہیں، امت کو ہمیشہ ایسے افراد کی ضرورت رہی ہے جو رہنمائی کا کام کر سکیں، امت کو صحیح راستہ بتا سکیں، جو چیلنجز سے خود بھی آگاہ ہوں اور امت کو بھی آگاہ کر سکیں، قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کے جو کام بیان کیے گئے ہیں، ان میں ایک کام "انذار" بھی ہے، ارشاد الٰہی ہے: "وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا فِيهِم مُّنذِرِينَ" [الصافات: ۷۲] (اور یقیناً ہم نے ان میں ڈرانے والے بھیجے)۔

وارثین انبیاء کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ اپنی قوم کو ڈرائیں، اور انذار کا جو عمل ہے اس کا اصل مطلب آخرت کے عواقب سے خبردار کرنا ہے، اور اس کے ساتھ دنیا میں جو حالات سامنے آرہے ہیں، اور اس وقت جو خطرات وچیلنجز ہیں ان سے آگاہ کرنا بھی اس میں شامل ہے، اس لیے کہ اگر یہ امت چیلنجز کو نہیں سمجھے گی اور خطرات کو محسوس نہیں کرے گی، تو ڈر اس بات کا ہے کہ وہ ان کا شکار ہو جائے گی، ظاہر ہے یہ کام کسی دوسرے دانشور طبقہ کے لوگوں کا نہیں، اصلاً یہ کام علماء کا ہے، لیکن علماء کو ان چیزوں کی فکر بہت کم ہوتی ہے، انہیں اس کی توجہ نہیں ہوتی کہ ہمارے اوپر کیا کیا ذمہ داریاں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ خود انہوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے تیار نہیں کیا ہوتا، اگر انہوں نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے تیار کیا ہوتا تو کوئی دشواری نہ ہوتی۔

ہمارا طبقۂ علماء جس کو "وارث انبیاء" کہا جاتا ہے، اس وراثت کے متعلق ارشاد نبوی ﷺ ہے: "ان العلماء ورثة الأنبياء وان الأنبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهماً انما ورثوا العلم فمن أخذ به أخذ بحظ وافر" [ترمذی: ۲۸۹۸] (علماء انبیاء کے وارث ہیں، اور انبیاء دینار ودرہم کا وارث نہیں بناتے، بے شک وہ علم کا وارث بناتے ہیں، جو اس کو حاصل کرے اس کو چاہیے کہ بھر بھر کر لے)۔

علم کا وارث بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ انبیاء علیہم السلام صرف ونحو کا وارث بناتے ہیں، بلاغت ومنطق کا وارث بناتے ہیں، یا صرف الفاظ کا وارث بناتے ہیں، بلکہ وہ حقائق ومعانی کا وارث بناتے ہیں، جن کو زندگی میں منتقل کرنے کے بعد انسان کی زندگی بدل جاتی ہے، اس کا رخ بالکل دوسرا ہو جاتا ہے، اور وہ انبیاء کی زندگی کا عکس ہوتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ان باتوں کی طرف ہماری بہت کم توجہ ہوتی ہے، یہ وراثت جو انبیاء علیہم السلام کی ہے، اس میں ہمیں وہی ترتیب قرآنی قائم رکھنی چاہیے جس کی طرف اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض کا تذکرہ کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے، ارشاد الٰہی ہے: "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ" (وہی ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے)۔

اس ترتیب قرآنی میں نمبر ایک پر تلاوت آیات ہے، یعنی پڑھنا ہے پڑھانا ہے، اور یہ بالکل ابتدائی مرحلہ ہے۔ نمبر دو پر تزکیہ ہے، یعنی اپنی زندگی کو سنوارنا

ہے، اور صرف اپنا تزکیہ نہیں کرنا بلکہ آگے اللہ جس کو توفیق دے، اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ امت کے لیے اس فکر کو لے کر کھڑا ہونا ہے، نمبر تین پر تعلیم کتاب وحکمت ہے، اس کے لیے مدارس و معاہد ہیں، جہاں یہ محنت ہوتی ہے، اور یہ تیسرا مرحلہ ہے۔

محنت کے تین میدان

انبیاء علیہم السلام کا جو کام ہے اس کے لیے محنت چاہیے، بغیر محنت کے دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا، دنیا کا کام بھی کرنا چاہیں تو محنت کرنی پڑتی ہے، کوئی آدمی یہ چاہے کہ ہم بیٹھے بیٹھے کچھ کرلیں یہ ممکن نہیں، محنت کے لیے ہمیں اپنے میدان کو طے کرنا ضروری ہے، اگر غور کیا جائے تو ہمارے سامنے محنت کے تین میدان ہیں؛ پہلا میدان اپنی ذاتی زندگی ہے، دوسرا میدان خود اپنے لوگ ہیں، اور تیسرا میدان غیروں کا ہے۔ اول تو یہ بہت کم لوگوں کو توفیق ہوتی ہے کہ وہ محنت کے میدان میں آئیں، اور اگر وہ محنت کرنے کے لیے میدان میں آتے بھی ہیں تو ان کی ترتیب صحیح نہیں ہوتی۔

پہلا میدان

محنت کا پہلا میدان خود اپنی ذات ہے، جب آدمی اپنے اوپر محنت کرے گا اور بنے گا اور اس کے اندر اللہ سے محبت پیدا ہوگی، اور آدمی جو کرے گا وہ اللہ کی رضا کے لیے کرنے کا مزاج بنائے گا، پھر اس کے بعد کاموں کے اندر طاقت پیدا ہوگی، جان پیدا ہوگی، اور یہ محنت کا پہلا مرحلہ ہے، ہمارے علماء کو ان باتوں کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ ہمیں کس طرح اپنے اوپر محنت کرنی چاہیے، اپنے کو بنانا چاہیے، اس کے لیے ہمیں ایک ایسا مرحلہ گذارنا چاہیے کہ ہمارے اندر وہ مزاج پیدا ہوجائے، ہمارا دل پاک وصاف ہو، اللہ سے مضبوط تعلق ہو، ہم جو کریں اللہ کی رضا کے لیے کریں۔ اس وقت اگر آپ غور کیجیے تو امت میں جو کچھ انتشار ہے، جو کچھ لڑائیاں ہیں اور جھگڑے ہیں، اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ ہماری محنت کا جو خاص میدان ہے، ہم نے اس میدان کی طرف توجہ نہیں دی، ہم بڑے بڑے کام کرتے ہیں لیکن ہمارے مقاصد دوسرے ہوگئے، ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اللہ راضی ہو، اللہ کے دین کا نام بلند ہو، اللہ کے دین کا کلمہ بلند ہو، وہ ہمارے لیے اللہ کی رضا کا ذریعہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ہمیں اصل مقصد حاصل نہیں ہوتا اور پھر اس میں ٹکراؤ کی صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں، حالانکہ اگر ایک شخص اللہ کے لیے کام کررہا ہے تو اس کے لیے جھگڑنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے سامنے نہ کوئی ادارہ ہے، نہ کوئی نام ہے، نہ اپنی ذات ہے، نہ عزت ہے، نہ دولت ہے، وہ کام صرف اللہ کے لیے کررہا ہے، جب وہ اللہ کے لیے کام کررہا ہے تو یہ ایسا راستہ ہے کہ اس میں ٹکراؤ کی کوئی صورت نہیں ہوتی، لیکن جب دوسرے مقاصد بھی ہوتے ہیں تو وہ ایسے ہوتے ہیں کہ جن سے ٹکراؤ کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

موجودہ دور کا یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے، اور ہم لوگ اس کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے، لہٰذا ہمیں اس پر توجہ کرنی چاہیے، ہم اپنی محنت کو سب سے پہلے مرحلہ میں اپنی ذات پر صرف کریں، اور کوشش کریں کہ ہمارے اندر وہ جذبات پیدا ہوں جو ہمارے بزرگوں میں تھے، اور ہندوستان اور اس کے علاوہ دنیا بھر میں اللہ والوں، اور مصلحین ومجددین نے جو کام کیا ہے، جس کی وجہ سے اللہ نے آج دین باقی رکھا، ان کی زندگیاں ہمارے سامنے ہوں، اور اس کے اعتبار سے سب سے پہلے ہم اپنی ذات کو بنائیں، انشاء اللہ جب ہماری یہ محنت ہوجائے گی، تب اگلے مراحل ہمارے لیے طے کرنا آسان ہوگا۔

دوسرا میدان

دوسرا میدان اپنوں میں محنت کرنے کا مرحلہ ہے، مگر محنت کی مختلف شکلیں ہیں، الحمد للہ کام بہت ہورہے ہیں، ظاہر ہے جب ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کی ضرورت نہیں ہے، تو جو بھی دین کے خیر کے کام ہورہے ہیں، ہمیں ان کاموں میں مدد کرنی چاہیے، اور اپنے اپنے علاقوں میں وہاں کے حالات کے اعتبار سے جو خلا ہو اس کو دور کرنا چاہیے۔

تیسرا میدان

تیسرا میدان غیروں میں محنت کرنے کا مرحلہ ہے، اس سلسلہ میں یہ بات خاص طور پر بار بار کہی جاتی ہے کہ اب جو اس وقت ملک اور پوری دنیا کے حالات ہیں، وہ بڑے ہی خطرناک ہیں، ان حالات میں ہمارے سامنے بڑے اندیشے آرہے ہیں، اگر ان حالات کو پیش نظر رکھا جائے تو ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، اور اس مسئلہ کا ہمارے سامنے اگر کوئی حل ہے تو وہ حل بظاہر ایک ہی نظر آتا ہے، اور وہ حل یہ ہے کہ ہم نے غیروں پر جو محنت نہیں کی، اس محنت کو بھی اپنے ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے، اب ظاہر ہے غیروں پر جو ہمیں محنت کرنی ہے، اس کے راستے ہمارے سامنے طے ہوں، ہمارے لیے اس ملک میں جو اس وقت حالات ہیں، ان حالات میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، اور لوگوں کے دماغوں میں نہ جانے کیا کیا زہر بھرا گیا ہے، ان حالات میں سب سے پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہم ملک کے شہریوں میں اعتماد بحال کریں، ہم اعتماد کی ایک فضا قائم کرنے کی کوشش کریں، بہت سے لوگ پیام انسانیت کا کام کررہے ہیں، الحمد للہ اب تو پورے ملک میں کام ہورہا ہے، اور اللہ کا شکر ہے الحمد للہ اب تو نتائج بھی ہمارے سامنے آرہے ہیں، انتہائی خطرناک ذہن رکھنے والے اور جن کے ذہنوں میں زہر بھرا ہوا ہوتا ہے، جب وہ مسلمانوں کی اور خاص طور پر دین دار طبقہ کی محنت دیکھتے ہیں، تو ان کے ذہنوں میں بڑی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔

بنیادی خلا

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بارہا فرماتے تھے کہ ہم اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتے، جب تک ہم اپنی محنت کے پہلے مرحلہ کے ساتھ ساتھ یہ کوشش نہ کریں کہ ہم ایک ماڈل تیار کریں گے، اور وہ ماڈل سماج کا ماڈل ہے، یعنی معاشرہ کا ایک ایسا ماڈل جو ہم غیروں کے سامنے پیش کرسکیں، مسلمانوں کا اس وقت جو ماڈل غیروں کے سامنے ہے، وہ ماڈل ایسا ہے کہ اس کو دیکھ کر مسلمانوں سے کوئی قریب نہیں ہوسکتا، حالانکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں بہت کچھ حصہ سوشل میڈیا کا ہے، لیکن میڈیا نے جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں وہ اپنی جگہ، مسئلہ صرف میڈیا کا نہیں ہے، بلکہ اس میں بہت کچھ حصہ خود ہماری ذاتی زندگی کا ہے، ہماری سماجی زندگی کا ہے، ہم نے جو ماڈل پیش کیا ہے وہ ماڈل صحیح نہیں ہے۔

اقتدار کا اسلامی تصور

مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ آج جو نوجوان علماء ہیں، وہ خود بہت ساری غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ میں اقتدار ہو اور ہم پورا اسلامی نظام قائم کردیں، کیونکہ اقتدار جب اسلام کا ہوگا اسی صورت میں ہم اسلام کو پوری طرح نافذ کرسکتے ہیں، اس میں کیا شبہ ہے کہ اسلام کا ایک بڑا حصہ بغیر اقتدار کے نافذ نہیں ہوسکتا، اس کی تنفیذ ممکن نہیں ہے، لیکن! ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہم جو اسلام کا اقتدار چاہتے ہیں، اس کے لیے مزاج ہموار کرنے کی ضرورت ہے، ہم جو نشیمن تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اس نشیمن کے لیے شاخ کی ضرورت ہے، اگر شاخ ہے تو نشیمن ہے، اور اگر شاخ نہیں ہے اور ہم بغیر شاخ ہی کے نشیمن تعمیر کرنا چاہتے ہیں، یا بہت کمزور شاخ پر نشیمن بنانا چاہتے ہیں، تو نشیمن ایک جھونکے میں بکھر کر رہ جائے گا، اس کے تار و پود بکھر جائیں گے، لہٰذا اس پورے اسلامی نظام کا جو نشیمن ہمیں تعمیر کرنا ہے، اور ہم جس خلافت اسلامیہ کا احیاء چاہتے ہیں، اس کے لیے پہلا مرحلہ شاخ کا ہے، جس پر یہ نشیمن تعمیر کرنا ہے، اور وہ شاخ ہے معاشرہ، اگر سماج تیار ہے، اور مزاج بنے ہوئے ہیں، تو آپ اس پر کتنا ہی بڑا بوجھ رکھ دیجیے وہ اٹھانے کے لیے تیار ہے، اس کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے، لیکن اگر شاخ کمزور ہے تو آپ کا نشیمن بہت دنوں تک نہیں چل سکتا۔

عالم اسلام کا المیہ

بعض تحریکات کی جذباتیت اور غلط فکر کے نتیجہ میں آج یہ بات پیدا ہوگئی ہے کہ پورے عالم اسلام میں اس وقت جو حالات ہیں، وہ حالات ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ وہ غلط طریقۂ کار کا نتیجہ ہیں، ہم نے یہ کوشش ضرور کی کہ ہم اسلام کا وہ نظام قائم کریں لیکن ہم نے یہ کوشش نہیں کی کہ یہ نظام جس شاخ پر ہمیں قائم کرنا ہے اور اس کے لیے ہمیں جو بنیادیں چاہئیں، ہمیں پہلے ان بنیادوں کو مضبوط کرلینا چاہیے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا نظام بکھر کر رہ گیا، مسلمانوں کی طاقتیں ضائع ہوگئیں، کتنا کشت و خون ہوا، اس کا تصور مشکل ہے، اگر آپ ان حالات کو دیکھیں تو سمجھیں گے اور آپ کو اندازہ ہوگا کہ پہلے مرحلہ پر ہمیں کس کی ضرورت ہے، ایک تو مرحلہ خود اپنی ذات پر محنت کا ہے، پھر دوسرا مرحلہ خود ہمارے لیے سماجی محنت کا ہے، جس پر ہمیں نشیمن تعمیر کرنا ہے، یعنی اس شاخ کو مضبوط کرنے کا مرحلہ ہے، اور یہ ایسا مرحلہ ہے کہ اگر آپ اس میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو آپ کے لیے آگے سارے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔

وقت کی ایک بنیادی ضرورت

یہ وہ متفقہ باتیں ہیں کہ اگر آپ ان کو لے کر کھڑے ہوں گے تو کوئی دوسرا آپ کے سامنے نہیں آئے گا، بلکہ ہر شخص آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوگا، یہ بات میں اپنے تجربہ کی روشنی میں آپ سے قطعی طور پر کہہ سکتا ہوں، یہ سماج کو بنانے والی باتیں ہیں، اس وقت پیام انسانیت کا جو کام ہورہا ہے یہ اس کی بنیادیں ہیں، اگر ہمارا سماج نہیں بنا ہے تو پیام انسانیت کیا کام کرے گا، اگر ہم مسلمانوں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، اور ہماری سماجی زندگی ٹھیک نہیں ہے، اور ہم کوئی بہتر نمونہ نہیں پیش کرسکتے تو ہم آخر آگے بڑھ کر کون سا کام کرسکتے ہیں اور کون سا نمونہ پیش کرسکتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات بہت بگڑ گئے اور پانی سر سے اونچا ہوگیا، اس لیے آگے بڑھ کر ہمیں کام کرنا پڑ رہا ہے، لیکن یاد رکھیے اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی بنیادوں کو مضبوط کرنا ضروری ہے، ہم بے شک آگے کام کرتے رہیں اور حالات کو دیکھتے ہوئے اس کی ضرورت بھی ہے، لیکن پہلے ہمیں اپنی بنیادوں کو مضبوط کرنا پڑے گا، ہمیں شاخ کی فکر کرنی پڑے گی، ہمیں جو نشیمن تعمیر کرنا ہے، اس کے لیے سماج کی شکل میں جو مضبوط شاخ چاہیے، اگر ہم نے اس کی فکر نہیں کی تو یہ ساری محنتیں نقش برآب ثابت ہوں گی، آگے اس کا کچھ نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے، لہٰذا جو علماء ہیں اور مختلف علاقوں کے ذمہ دار حضرات ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ اپنے مشن میں اس کو شامل کریں، آج ہمیں مسلمانوں کی زندگی کو ایک رخ پر لانے کی ضرورت ہے، اور جو سماجی بگاڑ پیدا ہورہا ہے، ہمیں اس سماجی بگاڑ کو دور کرنا ہے، اخلاقی بگاڑ کو دور کرنا ہے، معاملات کے بگاڑ کو دور کرنا ہے، معاشرتی بگاڑ کو دور کرنا ہے، تاکہ ایک ایسا ماڈل تیار ہو کہ اس کو دیکھ کر لوگوں کے سامنے ایک نمونہ آئے، اور لوگوں کے اندر کشش پیدا ہو، ایک شوق پیدا ہو، یہ آج اس وقت کی سب سے بڑھ کر ضرورت ہے۔

علماء کی ذمہ داری

اس وقت علماء کی ایک بڑی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ مکاتب کا جال بچھائیں، جگہ جگہ اسلامی اسکول قائم کریں، اس لیے کہ یہ بنیادیں ہیں، اس سے ہم سماج کو بہتر بنا سکتے ہیں، اگر آج ہم اپنے بچوں کے لیے تعلیم کا صحیح نظم کریں گے، اور تعلیم کے ساتھ اچھی تربیت دیں گے اور بچوں کو صحیح طریقہ پر پروان چڑھانے کی کوشش کریں گے تو یہی بچے آگے چل کر نمونہ بنیں گے، لیکن تربیت اگر صحیح طریقہ پر نہیں کی گئی تو آج ہمارے مدارس کا حال کیا ہے، ہمارے مدارس سے فارغ ہونے والوں کی اس وقت جو کیفیت ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس سے بعض مرتبہ آدمی کا سر شرم سے جھک جائے، ایسے واقعات پیش آرہے ہیں، ہماری یونیورسٹیوں، کالجوں اور جو تجارتی مراکز ہیں، اور جو اس کے علاوہ مختلف شعبہائے زندگی ہیں، ہمارے علماء وہاں جاتے ہیں تو بعض مرتبہ وہاں ایسا نمونہ سامنے آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک عالم اور اس کی زندگی میں کوئی ایسی بات بھی سامنے آسکتی ہے!!

اس وقت کا جو المیہ ہے، سب سے پہلے ہمیں اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، ہمیں اپنی زندگی کو بنانا ہے، اور اس کے ساتھ ہمیں مسلمانوں کی سماجی زندگی کی طرف توجہ دینی ہے، اس کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کرنا ہے، ہمیں اس کو ماڈل کے طور پر پوری انسانیت کے سامنے رکھنا ہے۔

پیام انسانیت کا فائدہ

پیام انسانیت کی جو محنت ہورہی ہے، اس کا ایک بڑا فائدہ سماج کی تشکیل کا بھی ہے، اس سے سماج بنتا ہے، اس لیے کہ جب خیر کے کام ہوتے ہیں تو ہمدردی کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے، ہم نے اس کا ایک یہ نتیجہ بھی دیکھا ہے کہ اکثر آپس میں جو اختلافات ہوتے ہیں، یہاں تک کہ جو بہت پرانے اور گہرے اختلافات ہیں، دیوبندی اور بریلویوں کے اختلافات ہوں، وہ رکاوٹ نہیں بنتے، وہ حضرات بھی کام میں شریک ہوتے ہیں، اس کی یہی وجہ ہے کہ اگر آپ پہلے ہی مرحلہ میں ان کے سامنے کسی ایسے عنوان سے جائیں کہ پہلے ہی مرحلہ میں اختلافات سامنے آجائیں، تو ایک ایسی دیوار کھڑی ہوجاتی ہے کہ وہ آپ کو دیکھنا پسند نہیں کریں گے، اور اگر آپ انسانیت کا عنوان اختیار کرتے ہیں تو آپ کہیں بھی جایئے، کوئی روکنے والا نہیں، ان رفاہی کاموں سے ہر ایک پر اثر پڑتا ہے، تو جو غیروں میں ہمیں کام کرنا ہے، وہ اپنی جگہ کرنا ہی ہے، لیکن یہ خود ایک ایسا کام ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہم سماج کو بہتر بنیادوں پر کھڑا کر سکتے ہیں اور پھر یہ کام تمام لوگوں کو جوڑنے کے لیے ایک بہتر ذریعہ ہے۔

دائرۂ مشن کی توسیع

آپ اپنے مشن میں سماج کو بہتر بنانا بھی شامل کیجیے، آپ مسلمانوں کی تشکیل کیجیے کہ وہ اپنی زندگی کو بہتر بنائیں، وہ اپنی زندگی کو نمونہ کی زندگی بنائیں، اپنے اخلاق کو ایسا بنانے کی کوشش کریں کہ لوگوں کے سامنے ایک بہتر نمونہ آئے، واقعہ یہ ہے کہ یہ اس وقت کی ایک بڑی ضرورت ہے، اور یہ حضرات علماء کی ایک بنیادی ذمہ داری ہے، اس لیے خاص طور پر علماء اس کو اپنے مشن کا ایک حصہ بنائیں، وہ مختلف علاقوں میں جو کام کر رہے ہیں، اور الحمدللہ جو محنتیں ہورہی ہیں وہ قابل قدر ہیں، اور ان تمام محنتوں کی ضرورت بھی ہے، ظاہر ہے اگر ہم مسلمانوں کو چھوڑ دیں گے، اور ان کی تعلیم کا انتظام نہیں کریں گے، تو یہ بچے کدھر جائیں گے، یقیناً اسکولوں ہی میں جائیں گے جہاں ان کے عقیدہ کا سودا ہوگا، ان کا ایمان ختم ہوجائے گا، اس لیے یہ ہماری بنیادی ذمہ داری ہے، اس لیے جگہ جگہ صحیح نہج پر اسلامی اسکولوں کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

ارتداد کی لہر

مہاراشٹر کے ایک سفر میں معلوم ہوا کہ وہاں ایک برادری ہے جس کی تعداد آٹھ لاکھ ہے، فی الوقت ان میں سے پچاس ساٹھ ہزار مرتد ہوچکے، اور بعض وہ ہیں جو ارتداد کی کگار پر ہیں، اس لیے کہ وہ سب کے سب جاہل ہیں، غریب ہیں اور خانہ بدوش ہیں، وہاں کوئی کسی کی فکر کرنے والا نہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس سال سے آر ایس ایس ان پر محنت کر رہی ہے، اور اب حالت یہ ہوگئی ہے کہ بعض بعض گاؤں پورے پورے ہندو ہوچکے ہیں، اور نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ اگر کوئی مسلمان وہاں داخل ہونا چاہے تو نہیں ہوسکتا، وہ اس کے لیے تیار نہیں، ظاہر ہے کہ یہ انتہائی تشویشناک صورت حال ہے، ایسے علاقوں میں ہم پیام انسانیت کے عنوان سے بآسانی داخل ہوسکتے ہیں، اور اس راستے سے ہم کسی نہ کسی صورت ان کو قریب کر سکتے ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے جو حالات ہیں وہ انتہائی خطرناک ہیں، گویا اس ملک کو دوسرے نظام پر ڈالنے کا پورا ایک نقشہ تیار کرلیا گیا ہے، اور ایک دیومالائی نظام یہاں کے لیے تیار کرلیا گیا ہے، اور اس کی کوشش کی جارہی ہے کہ جہاں ایسے لوگ آباد ہیں جن کے پاس کوئی نظام نہیں ہے، کوئی پلان نہیں ہے، وہ غریب ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں، ان کو خاص طور پر اس نظام میں پرو دیا جائے، اس نظام میں داخل کردیا جائے، اور غیر شعوری طور پر وہ لوگ اس کو قبول کرلیں۔

حقیقی خلا اور تدارک کی شکلیں

اس صورت حال میں ہمارے ہر ہر عالم کی یہ ذمہ داری ہے، جس شہر میں وہ رہتے ہیں، یہ طے کرلیجیے کہ کم از کم تیس کلومیٹر، پچیس کلومیٹر میں جو ہمارا رقبہ ہے، ایسی

کوئی بستی نہیں چھوڑیں گے کہ ہم وہاں نہ جائیں، ہم وہاں کی فکر نہ کریں، ہم وہاں کے حالات کا مطالعہ نہ کریں، ظاہر ہے پہلی مرتبہ میں آپ مکتب قائم کرلیں، اسکول قائم کرلیں یہ آسان کام نہیں ہے، لیکن یہ کوئی مشکل نہیں ہے کہ کم از کم آپ ان علاقوں میں دورے کریں، وہاں جائیں، آپ جب جائیں گے تو اندازہ ہوگا کہ حالات کیا ہیں، آپ جب جائیں گے اور وہاں کی فکر کریں گے، تو ان کے اندر کچھ نہ کچھ بیداری پیدا ہوگی، اور جب آپ کو لوگ دیکھیں گے تو انشاء اللہ بہت سے فتنے خود بخود فرو ہوجائیں گے، بہت سی خرابیاں جو پیدا ہورہی ہیں، ان کے راستے میں خود بخود رکاوٹیں کھڑی ہوجائیں گی، اور پھر اس کے بعد آپ کے سامنے بہت سے راستے ہیں، اگر آپ ان کو اختیار کریں گے تو کام مزید آسان ہوجائے گا، مثلاً آپ وہاں مدرسہ قائم نہیں کرسکتے، لیکن آپ کسی ایسے دیہات میں گئے جہاں پچاس گھروں کی آبادی ہے یا بیس گھروں کی آبادی ہے، تو وہاں پر کم از کم آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان کے بچوں کی تشکیل کیجیے اور ان کو ان اداروں میں لے آیئے جہاں دار الاقامہ ہوں، اگر وہ بچے دو چار سال بھی پڑھ لیں گے، چاہے پورا نہ پڑھیں تو کم از کم دین لے کر چلے جائیں گے، بہت ممکن ہے کہ اللہ ان کے ذریعہ وہاں والوں کے ایمان کی حفاظت کا ایک سامان کردے، اسی طرح ایسے بہت سے راستے ہیں، لیکن کم از کم آپ یہ طے کریں کہ اپنے اپنے علاقوں میں اس خلا کو پر کرنا ہے، آپ یہ بھی طے کریں کہ آپ اپنے پورے علاقے کے لیے گویا نائب نبی ہیں، جو کام انبیاء علیہم السلام کا تھا، انشاء اللہ وہ کام آج اللہ تبارک و تعالیٰ آپ سے لے گا۔

اخلاص کی ضرورت

دعوت کے کام میں یہ بنیادی شرط ہے کہ خود اپنی ذات پر بھی محنت کرنی ہے، وہ اس طرح کہ ہمارے اندر اخلاص پیدا ہو، ہمارے اندر کام کرنے کا جذبہ ہو، ہم جو کریں اس لیے کریں کہ اللہ راضی ہو، دین کا کلمہ بلند ہو، اگر خدانخواستہ ہمارے اندر یہ خیال پیدا ہوگیا کہ ہمارا نام اونچا ہو، ہمارے ادارے کا نام اونچا ہو تو یہ بھی اخلاص کے منافی ہے، حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے ایک مرتبہ پرانوں کے اجتماع میں کام کرنے والوں سے یہ بات پوچھی کہ جب تم گشت کرنے کے لیے جاتے ہو تو تمہاری نیت کیا ہوتی ہے، تم اس کو مولانا الیاس صاحب سے جوڑنا چاہتے ہو، یا مولوی یوسف سے جوڑنا چاہتے ہو، یا تبلیغی جماعت سے جوڑنا چاہتے ہو، تم کس نیت سے ملاقات کرتے ہو؟ بہت سے لوگوں نے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ لوگ تبلیغ سے جڑ جائیں، جماعت سے جڑ جائیں گے تو بہت کام ہوگا، مولانا نے صاف کہا: اگر تمہارے اندر یہ نیت ہے تو یاد رکھو تمہارے اندر اخلاص نہیں ہے، اخلاص جب ہوگا جب اس کو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑنا چاہو گے، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جوڑنا چاہو تو یہ اخلاص کی بات ہے، اگر تبلیغی جماعت سے جوڑنا چاہتے ہو تو اخلاص نہیں۔

مقصود کیا ہے؟

آج افسوس کی بات یہ ہے کہ جماعتوں اور اداروں میں بگاڑ پیدا ہورہا ہے، ہم فلاں سے جوڑیں گے، ہم فلاں شخصیت سے جوڑیں گے، یاد رکھو اخلاص جب ہوگا جب اللہ سے جوڑنے کی بات چلے گی، اور جب اللہ سے جوڑنے کی بات چلے گی تو سارے کے سارے دھارے ایک جگہ پر آکر جمع ہوں گے، ہر شخص کا یہ مزاج ہونا چاہیے، اور یہ جب ہوگا جب ذکر کا اہتمام ہو، اللہ والوں کی صحبت ہو، اور آدمی تھوڑا سا قربانی کا جذبہ پیدا کرے، اور یہ طے کرے کہ ہمیں جو کرنا ہے وہ اللہ کی رضا کے لیے کرنا ہے، اصل مقصود نہ ادارے ہیں، نہ ندوہ اور دیوبند ہے، نہ تبلیغی جماعت ہے، یہ سب وسائل ہیں، اصل مقصد وہ ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بیان کیا، اصل مقصد انبیاء کی بعثت کا مقصد ہے، جس کو اللہ نے قرآن مجید میں بیان کیا، لہٰذا ہمیں لوگوں تک قرآن مجید کی تعلیم پہنچانی ہے، ہمیں لوگوں کا دینی مزاج بنانا ہے، ہمیں ان کی تربیت کرنی ہے، ہمیں ان کی تعلیم کا انتظام کرنا ہے۔

اخلاص کے فوائد و ثمرات

یہ یقینی بات ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں اور وسائل بھی بدلتے رہتے ہیں، لہٰذا حالات کو سامنے رکھ کر وسائل کو بھی بدلنا پڑے گا، وسائل طے نہیں ہوتے، وہ بدلتے رہیں گے، اب اگر ہم نے وسائل پر زور دیا تو یاد رکھیے ہماری بڑی ناکامی کی بات ہے، ہمیشہ محنت کرنے کے لیے ایک مقصد ہو، اور مقصد کے لیے جو وسائل مناسب ہوں، تجربوں سے جو بات سامنے آتی ہے، ہم ان سے فائدہ اٹھائیں، ہم اس میں آگے بڑھتے چلے جائیں، لیکن کام کرنے والوں کو پہلے مرحلہ میں اپنی ذات پر محنت کرنی پڑے گی، اگر اپنی ذات پر محنت نہیں ہوئی تو ہم آگے جتنی محنت کریں گے، ہوسکتا ہے وہ محنت ناکام ہوجائے، حضرت مولانا علی میاںؒ کہتے تھے کہ اخلاص بنیاد ہے، اگر آدمی مخلص ہے تو مخلص کا سفینہ کبھی نہیں ڈوبتا، وہ ڈوبتے ڈوبتے پار لگ جاتا ہے، اور اگر کوئی غیر مخلص ہے تو اس کا سفینہ پار لگتے لگتے ڈوب جاتا ہے، اس کو کوئی نہیں بچا سکتا، شروع میں بڑا اچھا کام ہورہا ہے، اور ماشاء اللہ بڑی مدد ہورہی ہے، لیکن خدانخواستہ اگر ادارے مقصد بنالیے جائیں اور کام اس طرح کیا جائے کہ خدانخواستہ اپنی ذات کو مقصد بنالیا جائے تو یہ سارے کام غرق ہوجاتے ہیں، ان کاموں کی کوئی حقیقت نہیں رہ جاتی، اس لیے تمام کاموں میں اللہ کی رضا ہو، اور مقصد یہ ہو کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی بات پہنچائی جائے، کوئی دوسرا شخص کام

کررہاہےاس پر بھی ہمیں خوشی ہو، وہ جوکام کررہاہے وہ ہمارا کام کررہاہے، اس نے ہمارا کام ہلکا کردیا، اب ہم دوسری طرف چلے جائیں گے، ہم وہاں جا کر کام کریں گے، یہ مزاج بننا چاہیے، اگر ہمارا یہ مزاج بنے گا تو انشاء اللہ کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی، ہم آگے بڑھتے چلے جائیں گے۔

ہماری محنت کے تین میدان ہیں، نمبر ایک پر اپنی ذات پر محنت کرنی ہے، پھر اپنوں میں بھی محنت کرنی ہے، اور غیروں میں بھی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" [العنکبوت:۶۹] یعنی جو ہمارے لیے قربانی دیتا ہے ہم اپنے راستے اس کے لیے کھول دیتے ہیں، قربانی کی پہلی محنت اپنی ذات پر ہو، اور پھر وہ محنت اپنوں میں اور غیروں میں ہو، اللہ نے ہمارے سامنے تینوں میدان رکھے ہیں، لیکن یہ اللہ کی ترتیب ہے کہ پہلے مرحلہ میں ہمیں اپنی ذات پر محنت کرنی ہے، ایسی صورت میں ہمارا مزاج بن جائے گا، ہمارے اندر اخلاص پیدا ہوجائے گا، ہمارے اندر بلند اخلاق پیدا ہوں گے۔

بگاڑ کے دو بنیادی سبب

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے شیخ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ فرماتے تھے کہ اس وقت دنیا میں جو کچھ بگاڑ ہے، اور جو کچھ انتشار ہے اس کے صرف دو سبب ہیں: نمبر ایک اخلاص نہیں، نمبر دو اخلاق نہیں، اگر اخلاص بہت ہے لیکن خدانخواستہ اخلاق نہیں ہیں، ہمیں بات کرنے کا سلیقہ نہیں، ہمیں دوسروں کی قدر نہیں، تو ہم آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں، بعض مرتبہ یہ مزاج ہوتا ہے کہ اخلاص ہوتا ہے لیکن اخلاق کی بلندی نہیں ہوتی۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں وہ بھی سیکھنا ہے، ہمارا باطن بھی صحیح ہونا چاہیے اور ظاہر بھی صحیح ہونا چاہیے۔ اخلاص اور اخلاق کو پیدا کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ اللہ کی محبت پیدا کی جائے، جب اللہ کی محبت پیدا ہوگی تو اخلاص بھی آئے گا اور اخلاق بھی بلند ہوں گے، اور اللہ کی محبت پیدا کرنے کا راستہ یہ ہے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کیا جائے، اور اللہ والوں کی صحبت اختیار کی جائے، یہ نظام و ترتیب ہے، لیکن ہم لوگ اس کو سمجھتے نہیں، اور اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں، اور کام کے لیے جو شرائط ہیں وہ پورے نہیں ہوتے، اس کا نتیجہ ہے کہ کام کے جو نتائج سامنے آنے چاہئیں وہ نہیں آتے۔

طبقۂ علماء کا ایک ایک فرد اگر یہ طے کرلے کہ ہمیں اپنی زندگی سنوارنی ہے، سب سے پہلے مرحلہ پر اپنی ذات پر ہم کو محنت کرنی ہے، اپنا تزکیہ کرنا ہے اور پھر آگے بڑھ کر ہمیں محنت کرنی ہے، اور اللہ کے بندوں کو اللہ سے قریب کرنا ہے، اس کے لیے ہم جو محنت کرسکیں گے وہ کرنی ہے، اور ہمیں محنت کرنے والوں کا ساتھ دینا ہے، تو انشاء اللہ کام بڑھتا چلا جائے گا، اور لوگ جڑتے چلے جائیں گے۔

عزم مصمم کی ضرورت

آج اس ملک میں ہمیں حالات خطرناک سے خطرناک نظر آرہے ہیں، بظاہر امید کی کوئی رمق محسوس نہیں ہوتی، لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے سب آسان ہے، بعض مرتبہ لوگوں کی زبان پر بہت ہی مایوسی کی باتیں آجاتی ہیں، یاد رہے مایوسی کفر ہے اور قرآن مجید میں اس کا صراحت سے اعلان ہے، میں یقین کے ساتھ یہ بات کہتا ہوں کہ اس ملک میں جو حالات ہیں وہ بالکل مایوسی کے نہیں ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کے لیے میدان عمل میں آئیں، اور طے کریں کہ اللہ نے ہم کو مدرسہ بھیجا اور ہم فارغ ہوگئے، اب اللہ کے دین کے لیے، اللہ کی رضا کے لیے انشاء اللہ ہم اپنی جان لگائیں گے، اگر ہم یہ طے کرلیں تو آج ہمیں ناامیدیوں کے جو بادل نظر آتے ہیں، وہ سب چھٹ جائیں گے، اور سورج ایسا روشن ہوگا کہ اس سے پورا ملک روشن ہوجائے گا، کیا بعید ہے اس سے پورا عالم روشن ہو، لیکن اس کے لیے ویسا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے، ہم اس کے لیے ایسا مزاج بنائیں اور یہ طے کریں کہ انشاء اللہ اپنی ذات پر محنت کرنی ہے اور اپنوں میں محنت کرنی ہے، اور غیروں میں محنت کرنی ہے۔

نیا طوفان اور اس کا مقابلہ

ہمارے اس ملک میں اسی فیصد آبادی غیروں کی ہے، اگر ہم نے اس کو فراموش کردیا تو ہم اپنے آپ کو کسی قلعہ یا حصار میں بہت دنوں تک محدود نہیں رکھ سکتے، اگر ہم ان کے درمیان کام نہیں کریں گے تو ہم اپنے لیے کتنا ہی مضبوط قلعہ بنالیں وہ بہت دنوں تک بچ نہیں سکتا، وہ ختم ہوجائے گا، اور پھر ہمارے گھروں میں ایک طوفان داخل ہوجائے گا، اور وہ ہے ارتداد و لادینیت کا طوفان، پھر ہمارے لیے اپنے کو اس سے بچانا مشکل ہوگا، لہٰذا قبل اس کے کہ وہ طوفان ہمارے گھروں میں داخل ہو، ان شاء اللہ اپنے ملک کی اس اسی فیصد آبادی پر ہمیں محنت کرنی ہے، دین کا مزاج بنانا ہے، دین پر اعتماد کو بحال کرنا ہے، اور دین کے بارے میں ان کے اندر دلچسپی پیدا کرنی ہے، جب ہم ایسا سماج بنائیں، ان کے سامنے ایک ماڈل پیش کریں، پھر انشاء اللہ راستے کھلیں گے، اور آسانیاں پیدا ہوں گی۔

اللہ ہمیں محنت کے تمام مراحل پر عمل کی توفیق دے، ہماری راہ کو آسان کرے، اور مذکورہ باتوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہماری زندگی کو دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے، تمام مدارس کی حفاظت فرمائے، اور تمام اداروں کو دین کے لیے قبول فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

محاسن اسلام

اسلام میں مہمان نوازی کی اہمیت

مفتی محمد وقاص رفیع

مہمان کے آنے پر اُس کا پرتپاک استقبال کرنے، اُسے خوش آمدید کہنے اور اُس کی خاطر مدارات کرنے کا رواج روزِ اوّل سے ہی دنیا کی تمام مہذب قوموں کا شعار رہا ہے، ہر ملک، ہر علاقے اور ہر قوم میں گو کہ ''مہمان نوازی'' کے انداز واطوار اور اس کے طور طریقے مختلف ضرور ہیں، لیکن اس بات میں کسی قوم کا بھی اختلاف نہیں کہ آنے والے مہمان کے اعزاز واکرام میں اس کا پرتپاک استقبال کرنا، اسے خوش آمدید کہنا اور اس کی اپنی حیثیت کے مطابق بڑھ چڑھ کر ہر ممکنہ خدمت سرانجام دینا اس کا بنیادی حق ہے، اس لیے کہ دنیا کی ہر مہذب قوم کے نزدیک مہمان کی عزت وتوقیر خود اپنی عزت وتوقیر اور مہمان کی ذلت وتوہین خود اپنی ذلت وتوہین کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے مذہب اسلام نے ''مہمان نوازی'' کے متعلق جو بہترین اصول وقواعد مقرر کیے ہیں یا جس خوب صورت انداز سے اسلام نے ہمیں ''مہمان نوازی'' کے آداب وضوابط کا پابند بنایا ہے' دنیا کا کوئی بھی مہذب سے مہذب مذہب بھی اس کی ہم سری کا ہرگز دعویٰ نہیں کرسکتا۔

آپ اندازہ لگائیں کہ جو مذہب مہمان کے اعزاز واکرام کا تقابل میزبان کی ایمان جیسی عظیم دولت سے کررہا ہو بھلا اس نے اس کی ''مہمان نوازی'' کے متعلق کتنے کڑیل اور سخت اُصول و آداب مقرر کر رکھے ہوں گے؟ اس کا اندازہ درجِ ذیل احادیث مبارکہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے: چنانچہ حضور اقدسؐ کا پاک ارشاد ہے کہ: ''جو شخص اللہ جل شانہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، مہمان کا جائزہ (خصوصی اعزاز واکرام) ایک دن ایک رات ہے، اور مہمانی تین دن تین رات ہے۔ اور مہمان کے لیے یہ بات جائز نہیں کہ وہ اتنا طویل قیام کرے کہ جس سے میزبان مشقت میں پڑ جائے''۔

[بخاری: ۸/۳۲، مسلم: ۳/۱۳۵۲]

حضرت ابوشریحؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: ''میرے ان کانوں نے سنا ہے اور میری ان آنکھوں نے دیکھا ہے، جب رسول اللہؐ یہ ارشاد فرمارہے تھے کہ: ''جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے ہم سایہ کی تکریم کرے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کی جائزہ بھر (یعنی پہلے دن خوب اعزاز واکرام کے ساتھ) تکریم کرے۔ کسی پوچھا: ''یا رسول اللہؐ! ''جائزہ'' کیا ہے؟'' آپؐ نے فرمایا: ایک دن رات (مہمان کا خصوصی) اعزاز واکرام کرنا، مہمان نوازی تین دن تین رات تک ہوتی ہے اور جو ان کے بعد ہو وہ صدقہ شمار ہوتی ہے۔'' اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اچھی بات کرے ورنہ خاموش رہے''۔

[الادب المفرد: ج۱/ص۲۶۹]

حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص مہمان نوازی نہ کرے اس میں کوئی خیر نہیں''۔ حضرت سمرہؓ فرماتے ہیں کہ: ''حضورِ اقدسؐ مہمان کی ضیافت کا حکم فرمایا کرتے تھے''۔ [مجمع الزوائد: ج۸/ ص۳۲۱] حضرت ابو کریمہ السامیؓ بیان کرتے ہیں کہ: نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ: ''مہمان کی رات کو خاطر داری کرنا ہر ایک مسلمان پر واجب ہے، جس نے کسی کے گھر میں رات گزاری وہ شخص اس گھر والے پر ایک قسم کا قرض ہے اگر چاہے تو اسی دن اس قرض کو ادا کرے (یعنی وہاں رات گزارے) اور اگر نہ چاہے تو اسے چھوڑ دے''۔ (اور وہاں رات نہ گزارے) [الادب المفرد: ج۱/ص۲۶۰] ایک شخص نے دیکھا کہ حضرت علیؓ رو رہے ہیں، اس نے سبب پوچھا تو آپؓ نے فرمایا کہ: ''سات (۷) دن سے کوئی مہمان نہیں آیا۔ مجھے ڈر اور خوف ہے کہ کہیں حق تعالیٰ شانہ نے میری اہانت کا ارادہ تو نہیں کرلیا؟''۔

[احیاء العلوم: ج۴/ص۴۶۰]

بعض جگہوں اور بعض لوگوں کی یہ بھی عادت دیکھنے کو ملی ہے کہ مہمان بھلا کتنا ہی دور دراز کا سفر طے کرکے کیوں نہ آیا ہو یا مہمان کتنا ہی عزیز اور قریبی کیوں نہ ہو بہرحال اس کی مہمان نوازی اور اس کی خاطر مدارات کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی جاتی اس کا حل بھی رسولِ اکرمؐ نے اپنی امت کے سامنے خوب اچھی طرح پیش فرمایا

ہے، چنانچہ حضرت عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ: ''میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا: ''یا رسول اللہؐ! (اگر) آپؐ ہمیں کسی قوم کے پاس بھیجیں اور وہ لوگ ہماری ضیافت نہ کریں تو آپ کی رائے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ آپؐ نے فرمایا: ''میں بتاتا ہوں کہ مہمان کو کیا کرنا چاہیے؟ جب تم کسی قوم کے پاس جاؤ تو تم انہیں (اپنی مہمان نوازی کی طرف) متوجہ کرو! ، اگر وہ مہمان نوازی نہ کریں تو اس قدر لے لو جتنا کہ ایک مہمان کو لے لینا چاہیے''۔

[الادب المفرد: ج/۱ص ۲۶۰]

بہرحال مہمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کہیں جا کر اس قدر لمبا قیام نہ کرے کہ جس سے میزبان کو تنگی اور دقت پیش آنے لگے اور وہ کوئی ایسی حرکت کرنے لگ جائے کہ جس سے مہمان کو اذیت کا سامنا کرنا پڑے، مثلاً میزبان مہمان کی غیبت کرنے لگ جائے یا اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار ہونے لگ جائے کہ یہ سب امور میزبان کو گنہگار بنانے والے ہیں، لیکن یہ سب کچھ اُس صورت میں ہے کہ میزبان کی طرف سے مہمان کے قیام پر اصرار اور تقاضا نہ ہو، یا اُس کے انداز و اطوار سے غالب گمان یہ ہو کہ مہمان کا زیادہ قیام میزبان پر گراں نہیں ہے تو اُس صورت میں زیادہ لمبا ٹھہرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

اسی طرح مہمان کا میزبان سے ایسی فرمائشیں کرنا کہ جو وہ پوری نہ کرسکتا ہو اور اس سے اس کو دقت اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہو تو یہ بھی میزبان کو تنگی میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا دوسروں کے گھر میں جا کر چناں وچنیں کرنا، یہ چاہیے وہ چاہیے کہنا، ہرگز مناسب نہیں، جو وہ حاضر کر رہا ہے اس کو صبر وشکر سے بشاشت کے ساتھ لے لینا چاہیے۔ اس لئے کہ فرمائشیں کرنا بسا اوقات میزبان کی دقت اور تنگی کا سبب ہوتا ہے، البتہ اگر میزبان کے حال سے یہ اندازہ ہو کہ وہ فرمائش سے خوش ہوتا ہے، مثلاً فرمائش کرنے والا کوئی بہت قریبی عزیز یا دوست ہو اور جس سے فرمائش کی جائے وہ اس پر دل و جان سے جان نثار ہو تو پھر جو چاہے فرمائش کرسکتا ہے۔

[فضائل صدقات: ج/۱ص ۱۳۸]

چنانچہ ایک مرتبہ امام شافعیؒ بغداد میں امام زعفرانیؒ کے مہمان بنے، امام زعفرانیؒ روزانہ امام شافعیؒ کی خاطر اپنی ایک باندی کو ایک پرچہ لکھا کرتے تھے جس میں اس وقت کے کھانے کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ امام شافعیؒ نے ایک وقت باندی سے پرچہ لے کر دیکھا اور اس میں اپنے قلم سے ایک چیز کا اضافہ فرمادیا۔ دسترخوان پر جب امام زعفرانیؒ نے وہ چیز دیکھی تو باندی پر اعتراض کیا کہ میں نے اس کے پکانے کو نہیں لکھا تھا''۔ وہ پرچہ لے کر آقا کے پاس آئی اور پرچہ دکھا کر کہا کہ: ''یہ چیز حضرت امام شافعیؒ نے خود اپنے قلم سے اضافہ فرمائی تھی''۔ امام زعفرانیؒ نے جب اس کو دیکھا اور حضرت امام شافعیؒ کے قلم سے اس میں اضافہ پر نظر پڑی تو خوشی سے باغ باغ ہوگئے اور اس خوشی میں اس باندی کو ہی آزاد فرمادیا۔

[احیاء العلوم: ج/۲ص ۲۲۸]

حاصل یہ کہ اگر ایسا کوئی خاص اور قریبی عزیز اور دوست ہو کہ جس کو میزبان بھی دل وجان سے خوب چاہتا ہو تو اُس صورت میں یقیناً ایسی فرمائش بھی بڑے لطف کی چیز ہے۔

☆☆☆☆☆

سید احمد شہیدؒ اکیڈمی کی تازہ پیش کش

محبت کیا ہے؟

از:- بلال عبدالحی حسنی ندوی

محبت کی حقیقت، اس کے تقاضے اور اس کے مختلف مظاہر کا بیان، نہایت ہی آسان و مؤثر اسلوب میں۔

صفحات:-96 قیمت:-80

رابطہ:

رابطہ: سید احمد شہید اکیڈمیؒ رائے بریلی

موبائل نمبر:9919331295

پیام انسانیت

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

مولانا محمد اعجاز عرفی

انسان خدا کا محبوب ہے، وہ اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز ہے، وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے، بحر و بر، شجر و حجر، پھول، کلی، گلستاں، زمین و آسمان اور کائنات کی ساری چیز انسانوں کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے، انسان اس کائنات کا دولہا اور پوری کائنات اس کی دلہن ہے، قرآن کریم نے بلا تفریق تکریم انسانیت اور احترام آدمیت کا اعلان کیا ہے، حدیث میں تمام مخلوق انسانی کو عیال اللہ (خدائی کنبہ) قرار دیا گیا ہے، قرآن وحدیث نبوی کی ان ہدایات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے اسلام کی نظر میں قوم وملت، مذہب وطبقہ، رنگ ونسل، عربیت و عجمیت کی وجہ سے انسان کو عزت وکرامت کا مستحق نہیں ٹھہرایا گیا ہے، بلکہ اس کی شرافت وکرامت اور تمام تر احترام واکرام کا مدار انسانیت پر ہے، یعنی ہر انسان خواہ اس کا تعلق اسلام سے ہو یا عیسائیت سے، بدھ مت سے ہو یا جین ازم سے، وہ یہودی ہو یا پارسی، سکھ ہو یا ہندو، وہ اسلام کی نظر میں مقدس ومتبرک اور محترم ومعزز ہے، اسلام نے ہم انسانوں کو مذہب وملت کی تفریق کے بغیر خدا کے بندوں کی عزت وتکریم کا سبق ازبر کرایا ہے، مگر افسوس کا مقام ہے کہ اس وقت انسانوں اور بندگان خدا کے ساتھ انسانیت اور اس کی آدمیت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کے مذہب ومسلک، اس کے رنگ ونسل، اس کے طبقہ وگروہ کی وجہ سے معاملہ روا رکھا جاتا ہے۔ انسانیت کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کے عہدہ ومنصب کو نظر میں رکھ کر اس کے لیے احترام واکرام کی چادر بچھائی جاتی ہے، انسانوں کی خاطر مدارات میں اس کے سماجی اور سیاسی پس منظر کو مرکزیت دی جا رہی ہے، چند معمولی مفاد کی خاطر انسانیت کا جنازہ نکالا جا رہا ہے، انسانیت ہر طرف رسوا اور ذلیل ہو رہی ہے، اس کے دستار وتاج کو نیزوں پر اچھالا جا رہا ہے، امریکہ، افریقہ، صحرائے عرب، شام و مصر، ہند و برما، ہر جگہ خدا کے بندوں کے ساتھ وحشیانہ اور ظالمانہ برتاؤ ہو رہا ہے، انسانیت کا بدن چور چور ہے، اس کے جوڑ جوڑ کو توڑ دیا گیا ہے، اس کا قلب وجگر مجروح اور چوٹ کھایا ہوا ہے، چند ٹکوں کے لیے اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کے لیے انسانیت کو تذلیل وتعذیب کے جاں گسل مراحل سے گزارا جا رہا ہے، مگر دور دور تک اس کی کوئی خبر لینے والا نہیں۔

اسلام نے کہیں بھی انسان کے پیروں میں غلامی کی زنجیر نہیں ڈالی ہے، معاش سے لے کر معاد تک آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے، بلکہ اس کو اپنی زندگی کے شب و روز کو من پسند طریقے پر گزارنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، یہاں تک کہ اپنی پسند کا مذہب ومسلک کو اختیار کرنے کی آزادی دی ہے۔ اس کو فطری انسانی حقوق کی فراہمی کی ضمانت دی گئی ہے۔ مذہب کی آڑ میں زور زبردستی سے سختی سے روکا گیا ہے، کہیں لَا اِکْرَاہَ فِیْ الدِّیْنَ کا اعلان کیا گیا ہے، تو کہیں فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر کی تایید ربانی اور حکم الٰہی موجود ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیاوی امور تو درکنار مذہبی امور کے ترک واختیار میں بھی انسان کی فطری آزادی کے شرائط کو مجروح نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن میں صاف اعلان ہے کہ انسان کو ایک ہی مذکر ومؤنث یعنی آدم وحوا سے جنم دیا گیا ہے، اور ان کے درمیان جو قبائل و جماعت اور گروہ وگروپ کی تقسیم ہے وہ انسانیت کو مختلف خانوں میں بانٹنے کے لیے نہیں، بلکہ اس کی پہچان وشناخت کے ذریعہ کو مستحکم کرنے کے لیے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے آخری عوامی خطبہ میں یہ صراحت کر دی تھی کہ کسی عربی کو عجمی پر یا کسی گورے کو کالے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہوگی اور اس پر قرآن نے یہ کہہ کر مہر تصدیق بھی لگا دی کہ افضلیت اور اکرمیت کا مدار صرف تقوی اور طہارت ہوسکتا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ تقوی اور طہارت کے اوصاف سے مزین وآراستہ اس فرد بشر کی عزت وتکریم کی جائے، اس کا دوسرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تقوی اور طہارت کے اوصاف سے دست کش افراد یا دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کی تضحیک وتوہین کی جائے، مذہب کے نام پر تفریق کو ہوا دی جائے، غیر مسلموں کے ساتھ نفرت وتشدد کا معاملہ ملحوظ رکھا جائے، اسلام نے انسانوں کے درمیان محبت ومودت اور اخوت ومساوات کا معاملہ روا رکھنے کو کہا ہے، اسلام کی پوری تاریخ اور اسلامی حکومت کا پورا دورانیہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ اسلام کے ماننے والے مسلم حکمرانوں نے اپنی

رعایا کے ساتھ کتنی رواداری، مذہبی آزادی اور فراخ دلی وکشادہ ظرفی کا معاملہ روا رکھا ہے۔ مسلم ہو یا غیر مسلم، احباب ہوں یا اغیار، دین دار ہوں یا دین بیزار، عوام ہوں یا خواص، ان کا تعلق خانقاہ سے ہو یا گرجا گھر سے، مسجد سے ہو یا مندر سے مسلم حکمرانوں نے رواداری اور اخوت ومساوات کا وہ غیر معمولی سلوک پیش کیا ہے، جس کی انسانی تاریخ میں نظیر ملنی مشکل ہے۔

فلسطین میں یہودیوں کی غیر معمولی تعداد، مسلم ممالک میں عیسائیوں کا ہجوم اس بات کا شاہد ہے کہ مسلم حکمرانوں نے کبھی غیر اقوام وملل کے ساتھ تعصب، تشدد یا تنگ نظری کو راہ نہیں دی ہے، اسپین میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ شان دار حکومت کی تاریخ کے کسی موڑ پر یہ انکشاف نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ ظلم و ستم یا ناانصافی وعدم مساوات کا معاملہ روا رکھا ہے، ترکی کی سلطنت عثمانیہ نے سب کے ساتھ انسانیت اور اس کی آدمیت کے بنیاد پر معاملات کو حتمی شکل دی، خود وطن عزیز ہندوستان میں بابر اور ہمایوں سے لے کر اورنگ زیب اور بہادر شاہ ظفر تک رواداری، عدل گستری اور رعایا پروری کی قابل افتخار اور باعث رشک مثال ملتی ہے، مسلم حکمرانوں نے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو مکمل تحفظ فراہم کیا، انھیں ایک آزاد شہری کی حیثیت سے سارے سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور سماجی حقوق عطا کیے، اپنے اخلاف اور جانشینوں کو ہندو رعایا کا خیال رکھنے اور ان کے فطری حقوق ادا کرنے کی تلقین کی، رواداری اور رعایا دوستی کے میدان میں ان کے نقش قدم کو مٹانا ممکن نہیں، غرض کہ اسلام اور اسلام کے پیروکاروں نے ہر عہد میں انسانیت نوازی اور غیر مسلم نوازی کے وہ ناقابل محو نقش ثبت کیے ہیں، جو ہماری موجودہ حکومت اور موجودہ حکمرانوں کے لیے مشعل راہ ہے، وہ اس کو نمونہ عمل بنا کر، انسانیت اور آدمیت کا بھولا ہوا سبق یاد کرکے اپنی رعایا کو سارے مذہبی اور عقائدی حقوق کے ساتھ کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کرسکتی ہے، مگر اس وقت ملک کے حالات ناگفتہ بہ ہیں، انسانیت کے غنچے بن کھلے مرجھا رہے ہیں، صنف نازک پر ظلم ہورہا ہے، مادر رحم میں جنین کشی عام ہے، بچوں بوڑھوں کو تہ تیغ کیا جارہا ہے، بچیوں کی عصمت تارتار کی جارہی ہے، فرقہ وارانہ تشدد کی آگ بھڑکا کر برسوں کی کمائی کو منٹوں میں خاکستر کردیا جاتا ہے۔ کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک جو تعصب وتنگ نظری کا ننگا ناچ ہو رہا ہے، ظلم وستم اور جبر وتشدد کی جو مسموم ہوا چل رہی ہے، گؤ تحفظ کے نام پر اقلیتوں اور دلتوں پر جو مظالم کے پہاڑ توڑے جارہے ہیں، ملک میں حکومت وقت کے اشارے پر بزور بازو تبدیلی مذہب اور گھر واپسی کی جو اشتعال انگیز مہم چل رہی ہے، اقلیتوں کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے اور ان کے ثقافتی نقوش کو سبوتاژ کرنے کی جو علانیہ دھمکیاں دی جارہی ہیں، اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ ہم نے انسانوں کو انسان نہیں، اپنا غلام متصور کرلیا ہے، اونچ نیچ، ذات پات، اعلی اور ادنی کی ہوا چلا کر انسانوں کو ذلت وپستی کے غار میں ڈھکیلا جارہا ہے، معاش اور روزگار کے میدان میں ذات و مذہب، طبقہ وگروہ اور رنگ ونسل کی بنیاد پر امتیازکا رویہ اپنایا جارہا ہے، نئے نئے ہتھیار بنا کر انسانوں کے کشتے کے پشتے لگائے جارہے ہیں، اور المیہ یہ ہے کہ انسانی اور اخلاقی قدروں کی اس پامالی کا نہ کوئی نوٹس لینے والا ہے اور نہ کوئی مجرمین اور غنڈہ عناصر کے دست و بازو کو پکڑنے اور مروڑنے والا ہے، حالاں کہ ہندستان ایک کثیر تہذیبی، کثیر لسانی، کثیر ثقافتی معاشرہ ہے، یہاں رواداری اور انسانیت نوازی کے اصول پر عمل کرکے ہی ملک وقوم کو ترقی کی شاہ راہ پر ڈالا جاسکتا ہے، یہاں نعرہ تو یہ لگایا جارہا ہے کہ سب کا ساتھ سب کا وکاس، مگر یہاں مخصوص طبقات کا وکاس مقصود ہے اور اس کے علاوہ غریبوں اور دلتوں اور اقلیتوں کا وناش کا منصوبہ ترتیب دیا جارہا ہے۔ نہ صرف ہندستان بلکہ عالمی پیمانے پر ہر طرف نفرت وعداوت کی فضا قائم ہے، اختلاف و انتشار اور لاقانونیت، رشوت خوری، جمع خوری، کالا بازاری اور اقربا پروری کی وبا عام ہے، انسان انسان کا گلا کاٹنے پر تیار ہے، اس کا استحصال کرنا اس کی عادت ثانیہ بن چکی ہے، انسان ہی اپنے مزدور بھائی کا جونک کی طرح خون چوستا ہے اور معاوضے میں اس کو کچھ نہیں دیتا، مگر اس کی فکر کسی حکمراں کے دل میں انگڑائی نہیں لے رہی ہے۔

دوسروں سے کیا گلہ شکوہ کیا جائے، ہم خود بھی اخلاقی اقدار کے فروغ و استحکام اور انسانیت نوازی کے اصولوں کی تشہیر وتوسیع کے حوالے سے خواب خرگوش میں مبتلا ہیں، حالاں کہ ہمیں خیر امم کے عالم گیر خطاب سے نوازا گیا تھا، امت محمدیہ کی فضیلت و برتری کی وجہ وسبب تلاش کیا جائے تو یہی ہے کہ وہ پوری انسانیت کو راہ راست پر لانے کے لیے اور دعوت وتبلیغ کے اہم نبوی مقصد کی تکمیل کے لیے اس دنیا میں مبعوث کی گئی ہے، امت محمدیہ بندگان خدا کو خدا کی ذات و صفات کی معرفت کا سبق یاد کرانے کے لیے بھیجی

گئی ہے کہ وہ انسانوں کو باطنی اور خارجی گندگیوں اور غلاظت سے نکال کر روشنی اور پاکی کی دنیا کی سیر کرائے، مگر یہ امت خود خواب غفلت میں محو ہے۔ہمیں اس وطن میں حقانی و ربانی دین کی دعوت وتبلیغ کا اچھا اور سنہرا موقع میسر ہے، زمین تیار ہے، پورا میدان کھلا پڑا ہے، مگر ہم اس موقع کا فائدہ اٹھانے کو تیار نہیں، ہم عبادات سے لے کر معاملات تک ضعف و کمزوری کا شکار ہیں، ہمارا پڑوسی ہم سے خوش نہیں، وہ اذیت ومصیبت کی تصویر بنا رہتا ہے۔ ہمارے اخلاق مردہ ہو چکے ہیں، ہم زندہ تو ہیں، مگر ہمارے اندر تحرک و سرگرمی نہیں، گویا ہم زندہ لاش بن گئے ہیں، انسان دوستی اور فرض شناسی کا مادہ ہمارے اندر سے رخصت ہو چکا ہے، احساس ذمہ داری کا ثبوت پیش کرنا ہمارے بس کا نہیں، اسلامی اخوت ومروت کا دم نکل چکا، یہاں تو حال یہ ہے کہ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے، تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم، مسلمانوں کو انسانیت کو تباہی و بربادی کے غار سے نکال کر صراط مستقیم پر گام زن کرنے کی فکر نہیں، ہم اخلاقی بیماری کا شکار ہیں، مگر اس کا علاج ندارد، چند بالشت زمین کے لیے کشت وخون کا بازار گرم ہے، ہماری روح اور ہمارا عقیدہ ہی بیمار اور مریض ہو چکا ہے، ہمارے ایمانی شجر کی بنیاد سوکھ گئی ہے، اس لیے ساری انسانیت تباہی و بربادی کی طرف بڑھتی جا رہی ہے، ہم وہ نغمہ بھول گئے جو ہمیں گنگنانے کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا تھا، تحریک پیام انسانیت کے روح رواں اور اس تحریک اولین علم بردار مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ہماری اس غفلت کوشی کی بڑی اچھی تصویر کھینچی ہے اور جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے کس درجہ غافل ہے۔ان کے یہ جملے ہمیں بیدار کرنے اور ہمیں اپنی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کے لیے کافی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

”خدا نے انسان کو جس کام کے لیے پیدا کیا اس کو انجام نہ دے اور دوسرے ہزار کام کرے تو بیکار ہے، بلبل کی آواز سریلی، دل آویز، دلکش ہے لیکن وہ بولے نہیں تو کوا بہتر ہے، طاؤس رقص نہ کرے تو اس سے ہنس اچھا ہے، نمک کے اندر نمکینی نہ ہو اور اس کی جگہ یاقوت وجواہرات ہوں تو بیکار ہے، جو چیز جس کام کے لیے بنائی گئی ہے وہی کام انجام نہ دے تو کیا فائدہ؟“۔

[تحفۂ انسانیت، ص/۲۱]

مسلمانوں نے جب یہ کام انجام دیا، یعنی حسن اخلاق اور مروت ورواداری کو اپنے رویے میں جگہ دی تو اسلام عرب کے ریگ زاروں سے نکل کر افریقہ کے جنگلوں میں بھی پھیل گیا، وہ بہت جلد ایک آفاقی اور عالم گیر مذہب بن گیا تھا، لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے تھے، اسلام کا دائرہ روز بروز پھیلتا اور بڑھتا جا رہا تھا، کیوں کہ اس وقت لوگوں نے اسلام کو اور اسلامی تعلیمات کو کتابوں میں بعد میں پڑھا، اسلام کی صداقت و حقانیت، اس کی انسان دوستی، اس کی مساوات وانصاف کی روش اور عدم تفریق اور حسن اخلاق اور خوش خصالی کے عملی نمونوں کو اسلام کے پیروکاروں میں پہلے دیکھا، ہمارے اسلاف نے وعظ وخطابت سے کم، اپنے اعمال وکردار سے زیادہ لوگوں کے دلوں کو جیتا، ان کے اخلاق وکردار سے پتھر دل بھی موم ہو گئے، ان کے کردار کی پھواروں سے بنجر قلوب بھی لہلہانے لگے، دل کی سوکھی کھیتیوں میں ہریالی پیدا ہو گئی تھی، ہماری ایمان داری، ہماری دیانت داری، مخلصانہ طور طریق، ہمارے صبر وتحمل کی لہروں نے انھیں اپنا گرویدہ بنایا، غیر مسلموں نے دیکھا کہ انسانیت کی فلاح و بہبود، اس کا ہمہ گیر ارتقا اور اس کا بقا وتحفظ اسلام کے نظریہ مساوات واخوت میں پوشیدہ ہے، اس لیے انھوں نے اعمال وافعال سے متأثر ہو کر اسلام کا دامن تھاما اور اس طرح مختلف خطوں میں اسلام اپنے قدم مضبوطی سے جماتا رہا۔ اور اسلام کے ماننے والوں کا حلقہ وسیع ہوتا رہا۔

انسان اپنی انسانیت والی صفات کی وجہ سے ہی فرشتوں سے افضل اور برتر ہے، خدائے تعالیٰ نے اسی لیے فرشتوں کے سامنے انسانوں پر فخر و مباہات کا اعلان کیا تھا کہ وہ جن صفات کا حامل ہے، ان سے فرشتے عاری اور خالی ہیں، خدا نے انسانوں کو علم دیا، عقل وشعور کی دولت دی، اس کے اندر محبت اور گداز پیدا کیا، ان کے اندر رحم دلی اور نرم خوئی کا مادہ رکھا، وہ صرف گوشت پوست کا مجموعہ نہیں، بلکہ وہ تڑپنے اور مضطرب ہونے والا قلب وجگر بھی رکھتا ہے، مگر اس وقت کے حالات اور اقصائے عالم میں کشت وخون کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ یہ وہی انسان ہے جس پر خدا نے اپنی بارگاہ میں فرشتوں کے سامنے فخر ومباہات کا اعلان کیا تھا، خدا تعالیٰ تو فرشتوں کو شکست دینا اور ہمیں فتح کا پرچم تھمانا چاہتا تھا، مگر ہم اپنے رویے سے خود شیطانی راہ پر چل رہے ہیں اور اپنے آپ کو شکست دینا چاہتے ہیں، پیام انسانیت کے علم بردار مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے

انسانوں کے اندر موجود سوز وگداز اور اس کے قلبی اضطراب والتہاب کی کتنی عمدہ تصویر کشی کی ہے جس سے فرشتوں اور انسانوں میں حد امتیاز کھینچنے اور انسانی مقام ومرتبے سے شناسائی میں آسانی ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

"کسی پر خنجر چلے، کسی کے تلوے میں کانٹا چبھے تو اس کی کسک اپنے دل میں محسوس ہوتی ہے، انسان کے پاس جو سب سے بڑا سرمایہ ہے وہ رحم کا سرمایہ ہے، وہ محبت کا سرمایہ ہے، وہ ایک آنسو ہے جو انسان کی آنکھ سے کسی بیوہ کے سر کو ننگا، کسی غریب کے چولہے کو ٹھنڈا، کسی مریض کی کراہ کو سن کر ٹپک پڑتا ہے، آنسو کا وہ قطرہ جو سمندر میں ڈال دیا جائے تو اسے پاک کردے، گناہوں کے جنگل میں ڈال دیا جائے تو سب کو جلا کر نور سے بدل دے، فرشتے سب کچھ پیش کر سکتے ہیں لیکن آنسو کا وہ قطرہ نہیں پیش کر سکتے"۔

[تحفۂ انسانیت: ص/ ۳۶، ۳۷]

پھر انسان کی خوبیوں کی مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انسان کے پاس سب سے انمول چیز یہ ہے کہ وہ دوسرے کے درد سے متاثر ہوتا ہے، اس کے اندر محبت کا مادہ ہے، اس کو حرکت دینے والی کوئی چیز مل جائے تو وہ حرکت میں آجاتا ہے، پھر نہ مذہب کو دیکھتا ہے نہ ملت کو، نہ فرقے کو نہ علاقے کو، نہ وطن کو دیکھتا ہے، نہ ملک کو دیکھتا ہے، انسان، انسان کا دکھ دیکھتا ہے، اس کے درد کو محسوس کرتا ہے، جس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے اور وہ کھینچے پر مجبور ہے، اسی طرح انسان کے دل کا مقناطیس انسان کے دل کو کھینچتا ہے"۔ [ایضاً ص: ۳۷]

وطن عزیز ہندوستان میں بھی اسلام صرف اپنے پیام محبت ومساوات کی وجہ سے پھلا، پھولا اور پھیلا، چمنستان اسلام میں جو باغ وبہار آئی، وہ انسانیت دوستی اور محبت وخلوص کی دین ہے، مسلم حکمرانوں نے رعایا پروری اور انسانیت دوستی کے وہ چراغ روشن کیے جس میں دوسرے مذاہب کے دعوت وتبلیغ کے طریقے دھندھلا اور مرجھا کر رہ گئے اور اسلام کشمیر سے لے کر کنیا کماری تک مسلم حکمرانوں کی انصاف پسندی اور رواداری اور ان کی محبت وخلوص کی وجہ سے ان کے دلوں میں گھر کرتا گیا، مگر آج بہت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے کہ اس وقت نفرت کی کھیتی بوئی جارہی ہے اور اسی کی فصل کاٹی جارہی ہے، سیاست اور سماج دونوں نفرت اور تعصب کی آگ میں جل رہے ہیں، اور بے چارہ انسان اس کے شعلوں میں جھلس رہا ہے، سیاسی پارٹیاں اپنے مفادات کی روٹی سینکنے کے لیے ہمیں باہم دست بگریباں کر کے اپنا الو سیدھا کر رہی ہیں۔ ہم خود اپنا پیام محبت وانسانیت فراموش کیے بیٹھے ہیں، ۱۹۷۴ء کے اواخر میں مفکر اسلام حضرت مولانا ابو الحسن علی میاں ندویؒ نے جو تحریک پیام انسانیت کی داغ بیل ڈالی تھی، آج اس کو مزید سرگرمی اور فعالیت کے ساتھ کرنے اور اس کے سبق کو عام کرنے اور ذہن نشیں کرانے کی ضرورت ہے، چوں کہ اس وقت جس زعفرانی نظریات کی حامل سیاسی پارٹی کی مرکز اور مختلف ریاستوں میں حکومت قائم ہے، وہ محبت کے بجائے نفرت، تعمیر کے بجائے تخریب اور تحمل کے بجائے تشدد کی سیاست میں یقین رکھتی ہے، اس کو مذہبی تنازعوں اور مندر مسجد کے فرضی جھگڑوں سے آب و دانہ میسر آتا ہے۔ اس کے ایجنڈے میں ہی لڑاؤ اور حکومت کرو کی مذموم کوشش شامل ہے، ہمارے اندر علم وہنر کی روشنی تو ہے، مگر ہمارے قلب وجگر میں ظلمات کا بسیرا ہے، اس لیے برادران وطن اور خصوصاً فرزندان توحید سے یہ عاجزانہ التجا ہے کہ مذہب اور طبقہ کی سطح سے اوپر اٹھ کر سوچیے۔ اپنے کو انسانیت کے جوہر سے آشنا کیجیے، حدیث قدسی پر عمل کرتے ہوئے، بھوکے کو کھانا کھلائیے، پیاسے کو پانی پلائیے، ننگے کو کپڑا پہنائیے، بیمار کی تیمار داری کیجیے، مصیبت زدگان کی داد رسی کیجیے، یہی انسانیت ہے اور اسی کے ذریعے انسانوں کا دل جیتا جاسکتا ہے، اسلام نے ہر ایک کے ساتھ محبت اور انسانیت کا سلوک کرنے کو کہا ہے، اس نے قرابت داری اور رشتہ داری کو محبت یا انصاف کی بنیاد نہیں بنایا، برادری واد اور مذہبی کٹر پن کو جگہ نہیں دینا چاہیے، عقیدے، مذہب اور رسم ورواج کا بندھن ٹوٹنا چاہیے۔

جس طرح اللہ سب سے پیار کرتا ہے، ہمیں بھی پورے انسانی کنبے سے پیار کرنا چاہیے، ابھی ۸۰ فی صد برادران وطن کا ضمیر مردہ نہیں ہوا ہے، وہ حالات وحقائق سے باخبر ہیں، بس ان کی ذہن سازی کرنے اور ان کے ساتھ تعاون واشتراک کرنے کی ضرورت ہے، ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر اسلام کے پیام محبت ومساوات کا علم لے کر اٹھیے، خوشی کی بات ہے کہ پیام انسانیت کا جو چراغ آج سے چالیس بیالیس قبل الہ آباد میں جلایا گیا تھا، اس سے ملک میں قومی یک جہتی کی ہوا چلے گی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ ملے گا اور یہ ملک ہمہ جہت ترقی کی شاہ راہ پر گام زن ہوجائے گا۔

☆☆☆☆☆

اصلاح معاشرہ

غیبت کا بڑھتا ہوا رجحان

● ....شاہنواز فاروقی

ہماری زندگی کا عام تجربہ ہے کہ جیسے ہی کہیں دو چار لوگ جمع ہوتے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے غیبت کا ماحول بن جاتا ہے، ایسی غیبت کی جگہوں کا معاملہ عجیب ہوتا ہے، ان میں شریک ہر شخص غیبت کی مجلس کا سامع بھی ہوتا ہے اور اس کا صدر بھی، اہم بات یہ ہے کہ غیبت محفل میں شریک لوگوں کے لیے غیبت کرنے میں بھی لطف ہوتا ہے اور اس کی سماعت میں بھی۔

اکثر لوگ غیبت میں اس شدت سے شریک ہوتے ہیں کہ ان کی غیبت میں ''عالمانہ شان'' پیدا ہو جاتی ہے اور اسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جیسے غیبت کرنے والا نہایت ماہر فن ہے، بعض رجحانات طبقاتی ہوتے ہیں، یعنی ان کا اثر کسی خاص طبقے میں زیادہ ہوتا ہے، لیکن غیبت کے دائرے میں سب ''مساوی'' ہیں، اس سلسلے میں امیر اور غریب کی کوئی تخصیص نہیں، عالم اور جاہل میں کوئی فرق نہیں، مذہبی اور غیر مذہبی کا کوئی امتیاز نہیں، یہاں تک کہ مرد اور عورت میں بھی کوئی فرق نہیں، بلاشبہ عورتیں غیبت میں زیادہ ملوث ہوتی ہیں لیکن مرد بھی اس غیبت کے فن میں اتنی اہلیت پیدا کر چکے ہیں کہ غیبت کے شعبے میں خواتین کے شانہ بشانہ جد و جہد کرتے نظر آتے ہیں، یہ منظر نامہ کئی اعتبار سے حیران کن ہے، آپ کسی مسلمان کے سامنے سور کے گوشت کا ذکر بھی کر دیں تو اس کی طبیعت متلانے لگتی ہے، لیکن قرآن مجید نے کہا ہے کہ غیبت کا عمل اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کی طرح ہے، تاہم لوگوں کی طبیعت، جس طرح سور کے گوشت سے ابا کرتی ہے اس طرح مردہ بھائی کے گوشت سے ابا نہیں کرتی، آپ کسی مسلمان سے زنا کا ذکر کریں تو وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگے گا، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کو زنا سے زیادہ اشد یا شدید کہا ہے، مگر ہم غیبت پر چونکتے تک نہیں، اس صورتحال نے غیبت کا ہمارا کلچر بنا دیا ہے، یعنی غیبت ہمارے لیے ''اسلوب حیات'' بن گئی ہے۔

یہاں سوال یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کا زنا سے زیادہ شدید کیوں فرمایا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ کیوں دی ہے؟ غور کیا جائے تو زنا صرف عصمت کی پامالی ہے لیکن غیبت پورے انسانی وجود کی پامالی ہے۔ تاہم ہم زنا کو شدید سمجھتے ہیں اور غیبت پر چونکتے تک نہیں، سوال یہ ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ غیبت ایک باطنی عمل ہے، لیکن اس بات کا مطلب کیا ہے؟ اس بات کا مطلب یہ ہے کہ ہم مذہب کو خارج میں تو پہچانتے ہیں لیکن باطن میں نہیں پہچانتے، یہ صورتحال ہماری ظاہر پرستی اور باطن سے غفلت کا ایک مظہر ہے، قرآن مجید میں غیبت کی ہولناکی کو نمایاں کرنے کے لیے غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ غیبت ایک ایک سطحی یک جہتی Single Dimensional عمل نہیں ہے، غیبت میں جھوٹ، بہتان، عیاری، مکاری، بے حسی غرضیکہ بہت سی برائیاں جمع ہو جاتی ہیں، کہنے کو غیبت ایک لفظی عمل ہے لیکن یہ نفسیاتی قتل ہی جذباتی قتل ہے، ذہنی قتل ہے، تاہم قتل کی عام واردات میں مقتول قاتل کی مزاحمت کر سکتا ہے، اپنا دفاع کر سکتا ہے، غیبت کے عمل میں مقتول اپنے قتل سے لاعلم ہوتا ہے، وہ اپنے دفاع کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے، یہ چیزیں غیبت کی ہولناکی کو بہت بڑھا دیتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے غیبت کی کراہیت کو شدت سے بیان کیا ہے۔

سوال یہ ہے آخر ہم غیبت کرتے ہی کیوں ہیں؟ اور غیبت کا رجحان بڑھ کیوں رہا ہے؟ غیبت کا انسان کے تصور ذات سے گہرا تعلق ہے، انسان خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہے، لیکن وہ صرف اپنی برتری کے احساس پر قانع نہیں ہو جاتا، وہ اپنی برتری کو دوسروں کی کمتری سے ظاہر او رثابت کرتا ہے، یہی چیز اسے دوسروں کی برائی پر اکساتی ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ انسان دوسروں کی غیبت پر کھڑا ہو کر اپنا قد بلند کرتا ہے، اس تناظر میں دیکھا جائے تو غیبت انسان کی خود پسندی کا شاخسانہ ہے، اور خود پسندی شیطان کا ورثہ ہے، تجزیہ کیا جائے تو غیبت کے رجحان میں اس لیے اضافہ ہو رہا ہے کہ ہمارے ماحول میں خود پسندی کو فروغ دینے والے عوامل بڑھ رہے ہیں، جو عالمی کلچر ہم پر مسلط ہے اس میں انفرادیت پسندی بڑھ رہی ہے، نفس

کے تزکیے کے امکانات معدوم نہیں تو محدود ضرور ہو گئے ہیں، اب ''دوسرا'' ہمارے وجود کی توسیع نہیں، اس کی ضد ہے، دوسرا ہمارا حریف بلکہ ہمارا دشمن ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان خود کو دوسروں سے کمتر سمجھے ، نظری طور پر نہیں عملاً، تصوراتی سطح پر نہیں وجودی سطح پر، انسان اگر خود کو دوسروں سے کمتر سمجھنے لگے تو وہ پھر دوسروں کی تعریف کرے گا، ان کی مذمت نہیں، ان میں کمال تلاش کرے گا، زوال نہیں، اسلام انسان کی تکریم کی ایک ایسی بلند سطح متعین کرتا ہے، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی ، اسلام انسان کو اشرف المخلوقات کہتا ہے ، انسان زمین پر اللہ کا نائب ہے، رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ انسانی جان کعبہ کی حرمت سے بڑھ کر ہے، مولانا رومؒ نے کہا ہے کہ تہذیب کی اصل انسان کی تکریم ہے، ہمارے صوفیائے کرام کہتے ہیں کہ انسان کائنات اصغر یعنی چھوٹی کائنات ہے، یعنی وہ اس وسیع وعریض کائنات کا خلاصہ ہے، اسلامی تہذیب کا یہ تصور انسان اگر کسی کے دل و دماغ پر رتی برابر بھی اثر انداز ہو تو وہ کسی دوسرے انسان کی عدم موجودگی میں اس کی برائی نہیں کرے گا، اس تناظر میں دیکھا جائے تو غیبت کا بڑھتا ہوا رجحان اس امر کا غماز ہے کہ ہم اسلام کے تصور انسان کو یکسر فراموش کر بیٹھے ہیں، ہماری نظر میں اپنی کوئی تکریم ہے اور نہ دوسرے کی ، ہمارے ذہنوں پر انسان ایک سماجی حیوان ہے اور بس! چونکہ ہم زیادہ سے زیادہ اس بات کے قائل ہوتے جارہے ہیں کہ ہم ایک سماجی حیوان ہیں ، اس لیے ہمارے معاملات میں حیوانیت بڑھتی جارہی ہے۔

☆☆☆☆☆

ہماری مطبوعات

☆عمدہ کاغذ ☆بہترین طباعت ☆خوبصورت سرورق

نمبر شمار	اسمائے کتب	قیمت
۱	زعیمان لحرکۃ الاصلاح	70/=
۲	روداد چمن	200/=
۳	الصحافۃ العربیۃ	160/=
۴	تمرین الصرف	55/=
۵	رسالۃ التوحید	60/=
۶	دیوان الحماسۃ (اول)	165/=
۷	دیوان الحماسۃ (دوم)	165/=
۸	فتاویٰ ندوۃ العلماء (اول)	350/=
۹	فتاویٰ ندوۃ العلماء (دوم)	400/=
۱۰	فتاویٰ ندوۃ العلماء (سوم)	400/=
۱۱	مختار الشعر العربی (اول)	15/=
۱۲	مختار الشعر العربی (دوم)	18/=
۱۳	العقیدۃ السنیۃ	20/=
۱۴	تاریخ الادب العربی (الاسلامی)	125/=
۱۵	تاریخ الادب العربی (الجاھلی)	70/=
۱۶	مقدمہ شیخ عبدالحق دہلویؒ	50/=
۱۷	اسلام کی تعلیم	16/=
۱۸	تفہیم المنطق	150/=
۱۹	مبادی علم اصول الفقہ	20/=
۲۰	سوانح صدر یار جنگؒ	200/=
۲۱	مختار من صفۃ الصفوۃ	150/=
۲۲	شرح العقیدۃ الطحاویۃ	55/=
۲۳	اصول الشاشی	60/=
۲۴	علم اصول الفقہ	100/=
۲۵	حیات عبدالباریؒ	150/=
۲۶	تاریخ ندوۃ العلماء (اول)	170/=
۲۷	تاریخ ندوۃ العلماء (دوم)	180/=

ملنے کے پتے:

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء، لکھنؤ	9889378176
مکتبۂ اسلام، امین آباد، گوئن روڈ، لکھنؤ	9415912042
مکتبہ الفرقان، نظیر آباد، لکھنو	9936635816
مکتبہ علمیہ، شباب مارکیٹ ندوہ روڈ، لکھنؤ	9198621671
مکتبہ طوبیٰ، ندوی منزل، ندوہ روڈ، لکھنؤ	9005505629

ایک ضروری اعلان: بعض ناشرین کتب نے مجلس صحافت ونشریات کی کتابیں غیر قانونی طور پر طبع کرالی ہیں، اس لیے قارئین سے گذارش ہے کہ مجلس کی جملہ درسی وغیر درسی کتابیں درج بالا مکتبوں ہی سے خریدیں اور بذریعۂ ڈاک بھی طلب کریں، مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ساتھ آپ کا یہ نہایت مخلصانہ تعاون ہوگا۔

ناشر:

مجلس صحافت ونشریات

ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

رسید کتب

عبقری شخصیت-ایک مطالعہ

محمود حسن حسنی ندوی

نام کتاب: **مولانا ابوالحسن علی ندوی عبقری شخصیت**
مصنفہ: ڈاکٹر رفعت سلطان (بھوپال)
صفحات :۵۳۶
قیمت: ۴۰۰/روپے
ناشر :شبستان اپارٹمنٹ، سیکنڈ فلور، سید فتح علی اسٹریٹ، عیدگاہ ہلس، بھوپال۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر مختلف زبانوں میں ان کی زندگی میں اور وفات کے بعد کتابوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہا ہے، پیش نظر کتاب مولانا ابوالحسن علی ندوی عبقری شخصیت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ان کی زندگی میں لکھی گئی، اور ان کی نظر سے گزاری بھی گئی جس پر انہوں نے یہ فرمایا کہ اس میں ایک خلارہ گیا ہے وہ وفات کا خلا ہے، دراصل یہ ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھا جو برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال میں پیش کیا گیا تھا، اور ان تصاویر کے ساتھ مزین تھا جو مصنفہ کو مختلف مناسبتوں سے ان کو حاصل ہوئی تھیں مگر کتاب شائع کرنے پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے اس مزاج کی انہوں نے رعایت رکھی کہ ان کی شخصی تصاویر ہٹا کر ان تصاویر کو جگہ دی جو مختلف موقعوں میں ملکی وبین الاقوامی اعزازات و ایوارڈز کی ان کو کتب خانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سینٹر رائے بریلی سے حاصل ہوئیں اور اس اہتمام سے کتاب میں جگہ دی کہ اصل سے زیادہ صاف وشفاف نظر آتی ہیں، کتاب ۱۷/ موضوعات پر مشتمل ہے جو اس طرح ہیں:

۱-اعزازات، ۲-حالات زندگی، ۳-ملک و بیرون ملک اسفار ومشاغل، ۴-مزاج، عادات و معمولات، ۵- ندوۃ العلماء کا دور نظامت، ۶- قلمی جہاد، ۷- فکروفلسفہ، ۸- سیرت وسوانح نگاری تذکرہ نویسی، ۹-ادبی خدمات، ۱۰-اقبال شناسی، ۱۱-تاریخی تصانیف، ۱۲-سفرنامے، ۱۳- مکاتیب، ۱۴-امتیازی شان، ۱۵-علمی قدردانی، ۱۶-فہرست تصانیف، شجرۂ نسب۔

مصنفہ نے جو بات پیش کی ہے اس میں حوالوں کا اہتمام نظر آتا ہے اور تحقیق ونظر کی بات ملتی ہے، پھر بھی بعض مقامات پر سہو ہوا ہے، جیسے ایک جگہ جہاں دیدہ صفحہ ۵۲۴ کا حوالہ ہے مگر ذکر مصنف کا نہیں ان کے والد کا کردیا گیا ہے، جہاں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کا نام ہونا چاہیے تھا، اسی طرح شجرہ نسب وتذکرۂ افراد خاندان میں بعض جگہ فروگزاشت نظر آئی، لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ مصنفہ کو خود اس کا احساس ہے جسے وہ طبع جدید میں دور کریں گی، فہرست کتب ورسائل میں اردو کی تعداد ۳۰۳ دی ہے اور عربی کی ۱۹۹ ہے، مگر اب یہ تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہوچکی ہے، جسے www.abulhasanalinadwi.org میں جاکر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، کتاب کی ایک بڑی خوبی ان کے فکروعمل کا وہ خلاصہ ہے جسے صفحہ میں مصنفہ نے اس طرح پیش کیا ہے وہ لکھتی ہیں۔

”علی میاں کی تصانیف وتقاریر سے ان کی فکر کے اہم بنیادی پہلو سامنے آتے ہیں، ان کے فکر وفلسفہ کی عالیشان اور پائیدار عمارت انہیں مضبوط ستونوں پر قائم ہے۔

۱-راسخ عقیدہ اور پختہ ایمان کے بغیر مادیت کا مقابلہ ممکن نہیں۔

۲-وحی الٰہی ہدایت کا اصل سرچشمہ اور وہی فیصلہ کن۔

۳-قرآن کریم سے دلی مناسبت اور تعلق پیدا کرنا۔

۴-سنت نبوی اور سیرت نبوی سے قلبی تعلق اور ربط۔

۵-روحانی قوت کو بیدار اور ربانی طرز زندگی اختیار کرنا۔

۶-تعمیر واتحاد کی دعوت نہ کہ انتشار وتخریب کی۔

۷-جہاد فی سبیل اللہ کی روح کو بیدار کرنے کی ضرورت۔

۸-اسلامی تاریخ اور اس کے کارناموں کو پیش نظر رکھنا۔

۹-مادی تہذیب اور مغربی فکر وفلسفہ پر تنقید۔

۱۰-عقیدہ ختم نبوت پر زور اور قادیانی فتنہ کی سرکوبی امت مسلمہ کا بنیادی فرض۔

۱۱-امت مسلمہ نے ماضی میں جو کردار انسانیت کے نجات کے لئے ادا کیا، ہر دور میں اسی کردار کی ضرورت۔

۱۲-مسلم معاشرہ میں فکری ارتداد کی نشاندہی، اس کے مقابلے کے لئے طرز فکر میں انقلابی تبدیلی کی ضرورت۔

۱۳- صحابہ کرامؓ کی فضیلت اور دین میں ان کے اصل مقام ومرتبہ شناسی پرزور۔

۱۴- المیہ فلسطین کے بنیادی اسباب اور قضیہ کے حل کا صحیح طریقہ۔

۱۵- اسلامی ممالک کو مغرب کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا واحد راستہ، آزادانہ اسلامی نصاب اور نظام تعلیم۔

۱۶- نوخیز نسلوں کی تعلیم وتربیت اور اس کا صحیح طریق کار۔

۱۷- تحریک پیام انسانیت۔

۱۸- اسلامی تحریکات اور انسانیت کی بیداری کے لئے رہنما اصولوں کی وضاحت اور تبلیغ۔

بلاشبہ مصنفہ کی محنت، لگن، فکر، جہد مسلسل، کام سے عشق، شخصیت کی قدردانی وتعلق، اعتدال، انصاف، سبھی چیزیں لائق تحسین و قدردانی ہیں، ایک خاتون کا اس صفائی سے علمی کام پیش کرنا غیرمعمولی بات ہے جب کہ وہ مسلسل بیمار بھی رہتی ہیں، پیش نظر کتاب کو اس کے مستند حوالوں، اور معتبر تحقیقات کے ساتھ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سلسلہ میں اہم مراجع وماخذ کی فہرست میں نمایاں مقام کی حامل کتاب کی نظر سے اہل نظر دیکھ رہے ہیں، امید ہے ناظرین باتمکین بھی اس کی طرف توجہ فرمائیں گے اور فائدہ اٹھائیں گے۔

کتاب مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوہ، لکھنؤ، مکتبہ ندویہ ندوہ لکھنؤ، مکتبہ اسلام امین آباد، لکھنؤ اور الفرقان بک ڈپو نظیر آباد، مکتبۃ الشباب العلمیۃ ندوہ روڈ، لکھنؤ اور سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات رائے بریلی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی جدید ودیدہ زیب طباعت

المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ

یعنی امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی مفصل سوانح حیات، خاندانی خصوصیات، وہبی کمالات، خلفاء کی ترتیب زمانی میں حکمتِ الٰہی ومصلحتِ اسلامی، اسلام کے مفاد میں خلفائے ثلاثہؓ کے ساتھ حضرت علیؓ کا بے نظیر اخلاص وتعاون، خلافتِ مرتضوی کا عہد، اور اس کی عظیم مشکلات، بے نظیر زاہدانہ سیرت ومصلحانہ ومربیانہ کردار، فرزندانِ والامرتبت (حضرت حسنؓ وحضرت حسینؓ) کی عطربیز سیرت واخلاق اور ان کے اپنے اپنے وقت میں صحیح فیصلے اور اقدامات، آلِ رسول (ساداتِ کرام) کے اعلیٰ اخلاق وشمائل، امت کی اصلاح وتربیت کی دائمی فکر، ہر عہد میں ان کا قائدانہ واولوالعزمانہ کردار، مستند کتب تاریخ، ناقابل انکار واقعات وحقائق، اور تجزیاتی وتقابلی مطالعہ کی روشنی میں

از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

صفحات: ۴۰۴ قیمت: ۲۸۰ روپے

تحفۂ انسانیت (حدیث مالوہ)

یہ کتاب مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے اس دورہ کی بولتی ہوئی روداد ہے جو انہوں نے حلقہ پیام انسانیت کے تحت بھوپال، اُجین، اندور اور مالوہ کا کیا تھا، جس میں جابجا طلباء واساتذہ، وکلاء وجج صاحبان، سیاسی وعلمی شخصیتوں اور مذہبی رہنماؤں سے خطاب کیا گیا ہے، اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت ملک کو اصل خطرہ کس چیز کا ہے اور علماء ودانشور طبقہ کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

صفحات: ۱۸۴ قیمت: ۱۰۰ روپے

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

پوسٹ بکس نمبر ۹۳، ندوہ کیمپس، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

فون نمبر: 0522-2741539، موبائل نمبر: 9889378176

ای میل: airpnadwa@gmail.com

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال : ماہِ صفر کو بعض لوگ اپنے خیال میں نحس سمجھتے ہیں اوران کا کہنا ہے کہ یہ مہینہ برکتوں سے خالی ہے اوراس مہینہ میں آسمان سے بلائیں اور آفتیں نازل ہوتی ہیں، اس لیے اس مہینہ میں کثرت سے تلاوت اور درود کا اہتمام کرنا چاہیے، ان کا ایسا کہنا اسلامی نقطۂ نظر سے کیسا ہے؟

جواب: اسلام میں کوئی وقت، کوئی دن یا کوئی مہینہ نامسعود و نامبارک نہیں، بلکہ ایسا کہنا زمانہ کو برا بھلا کہنا ہے، جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے: ”یؤذیني ابن آدم یسب الدھر و أنا الدھر بیدي الأمر، أقلب اللیل والنھار“ [صحیح مسلم: ۴۴۵۲] لہٰذا ماہِ صفر کو نحس خیال کرنا یا یہ کہنا کہ اس مہینہ میں آسمان سے بلائیں ا اور آفتیں نازل ہوتی ہیں، بے اصل اور اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان توہمات اور باطل نظریات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: ”عن أبي ھریرۃ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لاعدوی ولاطیرۃ ولاصفر ولاھامۃ“ البتہ قرآن مجید کی تلاوت اور درود شریف کا اہتمام اس مہینہ کے علاوہ بھی کثرت سے کرنا چاہیے۔

سوال : عام رواج یہ ہے کہ ولیمہ یا شادی کے موقع پر مہمان ایک لفافہ میں کچھ روپے رکھ کر میزبان کو دے جاتے ہیں اور مہمان اسے ایک ضروری رواجی عمل سمجھتے ہیں، کیا اس رسم کی اسلام میں کوئی اصل ہے؟

جواب: یہ کوئی شرعی عمل نہیں ہے، اگر کوئی شخص اس کو شرعی عمل سمجھے بغیر اور کسی سماجی اور اخلاقی دباؤ کے بغیر خوشدلی سے بطور ہدیہ کوئی رقم دے تو اس کی گنجائش ہے کیونکہ یہ شرعاً ہبہ ہے اور ہبہ کسی بھی شخص کو کسی بھی موقع پر اپنی رضامندی اور رغبت سے کیا جاسکتا ہے [البحر الرائق: ج ۷/ص ۴۸۳] لیکن اگر سماجی دباؤ کے تحت لوگ اس کو لازم سمجھنے لگیں یا حکم شرعی کا درجہ دینے لگیں تو یہ صحیح نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عمل سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ دعوت یا ولیمہ کے موقع پر اس طرح رقم پیش کی گئی ہو، اس لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس قسم کا عمل آہستہ آہستہ سماج میں لازم اور واجب کا درجہ حاصل کرلیتا ہے جو درست نہیں۔

[مرقاۃ المفاتیح: ج ۱/ص ۳۳۶]

سوال: مہر کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے اور اس کی کم سے کم مقدار کیا ہے؟

جواب: مہر بیوی کا قرآن وسنت سے ثابت شدہ لازمی اور شرعی حق ہے اور اس کی ادائیگی شوہر پر واجب ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا“ [سورہ نساء: ۴۰/۷]۔

حدیث شریف میں مہر کی کم سے کم مقدار دس درہم یعنی موجودہ اوزان کے مطابق ۳۲ گرام چاندی ہے اور زیادہ کی کوئی تعیین نہیں البتہ مہر کی مقدار میں مبالغہ سے کام لینا اور ناقابل ادائیگی مہر رکھنا شریعت میں محبوب نہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا: ”لوگو! مہر زیادہ نہ رکھا کرو، اگر زیادہ مہر رکھنا دنیا کی نگاہ میں عزت وشرافت اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقویٰ کی بات ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق تھے۔

[ترمذی، ابوداؤد]

معلوم ہوا کہ مہر زوجین کی مالی پوزیشن کی رعایت کرتے ہوئے اوسط درجہ کا ہونا چاہیے۔

سوال : ایک مرد وعورت کا آپس میں نکاح ہوا اور دونوں نے ایک ہی دن تنہائی میں گذارا، پھر طلاق کی نوبت آگئی تو ایسی صورت میں کتنا مہر واجب ہوگا، جب کہ میاں بیوی کے درمیان صرف تنہائی ہوئی، ازدواجی تعلقات قائم نہیں ہوئے ہیں؟

جواب: اگر میاں بیوی کے درمیان اتنی دیر کی تنہائی ہوئی جس میں ازدواجی تعلق قائم کیا جاسکتا تھا، اور کوئی رکاوٹ اس میں نہیں تھی تو مہر کے معاملہ میں یہ تنہائی صحبت کے حکم میں ہوگی اور کل مہر واجب ہوگا، قرآن مجید میں اس کا واضح حکم موجود ہے: ”لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَافَرَضْتُمْ“. [سورہ بقرہ: ۲۳۱/۲]، وقال العلامۃ الکاسانی: المھر یتأکد بأحد معان ثلاثۃ: الدخول والخلوۃ الصحیحۃ وموت أحد الزوجین“.

[بدائع الصنائع: ج ۲/ص ۵۸۴]

☆☆☆☆☆

Postal Regd. No:S.S.P/LW/NP/63/2018-2020
R.N.I. No : UP.URD./2001/6017
Published on 8th and 23rd of every month
Date of Posting: 10,12 / 25,27
Posted at R.M.S. Charbagh, Lucknow-04

Fortnightly

TAMEER-E-HAYAT

Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow-07

Ph. Off. : 0522-2740406
Office Time :07:30 am To 01:30 pm
Website : www.tameerehayat.com
Email : tameer1963@gmail.com
info@tameerehayat.com

Vol. No. 55 Issue No.24

25 October 2018

RK JEWELLERS
Renowned Name in Jewellery

Haji Abdul Rauf Khan
Haji Mohd. Faheem Khan
Mohd. Owais Khan

Shop : Sarai Bans, Akbari Gate,
Chowk, Lucknow - 226003
Ph.: 0522-2267910
+91-9415108039

R.K. Clinic Research CENTRE

R. K. CLINIC
& RESEARCH CENTRE
Dr. Mohammad Fahad Khan
M.D.

विशेषज्ञ पेट एवं उदर रोग, श्वास एवं चेस्ट रोग, एण्ड्रोक्रायोनोलोजी एवं मधुमेह रोग

24 HOURS EMERGENCY SERVICES AVAILABLE

G-1, Aman Apartments, Chaupatiyan, Opp. Power House, Lucknow
Ph.: 0522-2651950, 9415006983

لکھنؤ کے قدیم مشہور و معروف صندل سے تیار کردہ

روغنیات، عرقیات، کولر پرفیوم، کار پرفیوم، روم فریشنر، فلور پرفیوم، روح گلاب،
روح کیوڑہ، عرق گلاب، عرق کیوڑہ، اگربتی، ہربل پروڈکٹ

خوشبودار عطریات

: کی ایک قابل اعتماد دوکان :
ایک مرتبہ تشریف لاکر خدمت کا موقع دیں
تیار کردہ

اظہارسن پرفیومرس

اکبری گیٹ، چوک لکھنؤ
برانچ: C-5، جنپتھ مارکٹ، حضرت گنج

IZHARSON PERFUMERS
H.O. : Akbari Gate, Chowk, Lucknow
Tel : 0522-2255257 - Mobile : +91-9450462665
Branch : C-5 Janpath Market, Hazratganj
Lucknow 226001 U.P. INDIA Cell : +91-9415784932
E-mail : izharsonperfumers@yahoo.com

DSGN. BY: SAAD HAMDAM (MALEGAON, M.S.) @9860448783

We accept debit and credit cards from all card associations
VISA Maestro MasterCard NET BANKING
PAY ONLINE
www.tameerehayat.com

Editor *Shamsul Haq Nadwi*,
Printed & Published by *Athar Husain*
On behalf Majlis-e-Sahafat-wa-Nashriyat at
Azad Printing Press Mahboob Building
Nazirabad, Lko. Ph: 9415100085